اے ضمیرؔ آواز تیری رہبرِ منزل بنی
جب کوئی آیا مسافر راستہ بھٹکا ہوا

خواجہ ضمیرؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدائے ضمیر

○

ہر عظمتِ حیات کی منزل دکھا گیا
میرا ہر ایک شعر صدائے ضمیر ہے

○

خواجہ ضمیر

○ نام مصنف — خواجہ ضمیرؔ

○ حضرتِ والد صاحب کا نام نامی — حکیم میر حیدر صاحب

○ نام مجموعۂ کلام — صدائے ضمیر

○ تزئین و ترتیب — ادارہ محفلِ ادبؒ

○ تعداد — ایک ہزار

○ سنِ اشاعت — ماہِ جون ۱۹۹۳ء

○ سرِ ورق — جناب سلام خوشنویس

○ کتابت — اردو کتابت گھر ۱۷-۸-۲۱۶ باغِ جہاں آرا حیدرآباد

○ زیرِ اہتمام — حسینی اکیڈیمی حیدرآباد اے پی

○ طباعت — دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار

○ قیمت — تیس روپے

ملنے کے پتے

○ خواجہ ضمیر مکان نمبر ۷-۳-۱۹۸/۲/۸۲/۹۸ اہتمام نگر مسجدِ عائشہ یاقوت پورہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۳

○ اردو کتابت گھر مکان نمبر ۱۷-۸-۲۱۶ باغِ جہاں آرا و یاقوت پورہ حیدرآباد

میں اِس مجموعہ کلام صدائے ضمیر
کو اپنے والدین کے اسمائے گرامی سے
معنون کرتا ہوں جن کی دعاؤں نے مجھے
سنوارا اور اِس قابل بنایا ہے۔

خواجہ ضمیرؔ

فہرست

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
(ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی)

صدائے ضمیر کا اعتبار

حکیم خواجہ ضمیر صاحب سے میری بڑی دیرینہ شناسائی ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایم ۔اے (۱۹۷۳) کا طالب علم تھا، وہ اکثر و بیشتر بزم حسان کے ماہانہ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے، اس کے بعد سے شہر میں ہونے والی مختلف محافل شعری میں موصوف سے ملاقاتیں رہیں وہ ہمیشہ اس عاجز کے مداح اور قدر داں رہے ۔ پچھلے دنوں انہوں نے مجھ سے اپنے اولین شعری انتخاب صدائے ضمیر پر اظہار رائے کی خواہش کی اور میں کسی طور انکار نہ کرسکا ۔ دراصل دنیائے علم و ادب میں یہ وطیرہ عام ہے کہ تصنیف و تالیف خصوصاً شاعری کے باب میں شاعر کے کلام اس کے فکر و نظر پر مقدمہ، پیش لفظ، تعارف و تقریظ کی کوئی نہ کوئی صورت ہو جس سے کتاب اور صاحب کتاب کی استعداد و قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فن کے صحیح خدوخال سامنے آسکیں ۔

خواجہ ضمیر حیدرآباد کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی شعر گوئی کو کوئی ۳۰ تیس ۳۵ پینتیس برس سے زیادہ کا عرصہ گذرا ہو اگر وہ چاہتے تو اس دوران اپنے دو ۲ تین مجموعے شائع کروا سکتے مگر شاعر کے حالات نے اس کی اجازت کب دی کہ وہ "ہزاروں خواہشیں" ایسی کے ہر خواہش کی تکمیل کے لئے سرگرداں رہے ؎

زندگی دے شاعر برباد کی قسمت بدل ذوقِ فطرت کو بدل یا پھر مری حالت بدل
اے بدلنے والے میری فکر کی صورت بدل نعمتِ آرام سے کچھ درد کی لذت بدل

ورنہ میری شاعرانہ زندگی مٹ جائے گی
صفحۂ کونین سے زندہ دلی مٹ جائے گی

(نظم شاعر)

چنانچہ صدائے ضمیر کا شاعر زندہ دل زندہ ضمیر شاعر ہے۔ پیشے کے لحاظ سے خواجہ ضمیر طبیب ہیں اور وہ یہ پیشہ آج بھی اپنی بے شمار کمزوریوں کے باوجود معتبر سمجھا جاتا ہے ویسے بھی ضمیر صاحب نیک نفس، خاموش، بے طبع ملنسار ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے انہوں نے ابتدأ حیدرآباد کے کہنہ مشق صاحب عروض حکیم و ڈاکٹر استادِ سخن سید شاہ امین علی نیساں سے تلمذ اختیار کیا لیکن جلد ہی استاد نے اصلاح سے بے نیاز کردیا۔ مزید انہیں اپنے وقت کے مشہور اور اچھے شعراء کی ہمنشینی وہم جلیسی حاصل رہی جس نے ان کے ذوق و شوق کو ممیز کیا۔ شاعری میں یوں تو وہ کم و بیش سبھی اصناف پر دسترس رکھتے ہیں کیا نظم، کیا رباعی، قصیدہ ہو یا مرثیہ، حمد و نعت وغیرہ لیکن غزل گوئی سے زیادہ

رغبت دکھائی دیتی ہے۔ غزل گوئی کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ ہر شاعر غزل ہی سے اپنی شعر گوئی کی ابتداء کرتا ہے' عرصہ ہوا غزل نے ہماری تہذیب و تمدن کو سنوارنے اور سجانے میں اپنا حصہ ادا کیا' میر غالب اور مومن نے اس صنفِ سخن کی روایت کو نئی راہوں پر گامزن کرنے کی دانستہ اور شعوری کوشش کی۔ جس کی وجہ سے غزل میں رمزیت' معنویت تصوف و تفکر جدت و اسلوب کے وہ وہ کرشمے دکھائی دیئے کہ ایک عالم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ غزل ہی ہے جس نے حسن و عشق کے ہمراہ رومانیت کی مختلف جہتوں کو اجاگر کیا یوں غزل گوئی کے موضوعات محدود نہ رہ سکے اور نہ ہی اس کی مقبولیت میں کچھ فرق آیا۔ اس کے ذریعہ انسانیت کے تقاضے' سوز و گداز جذبات و احساسات' داخلیت و خارجیت بھی کچھ نمایاں ہو گئی جو اب سماجی و سیاسی افکار و خیالات پس منظر و پیش منظر کے ساتھ انسانی حیات کی ترجمانی کہلائی طرفہ تماشہ بیسویں صدی کے ابتدائی تین چار دہوں میں شعری نظریات میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ مولانا حالی کی اصلاحات نے شاعری کا جو رنگ و آہنگ بدلا تھا وہ مزید ترقی پسند تحریک کی وجہ سے تیکھا ہو گیا اس جدت طرازی نے غزل گوئی کے رجحانات ہی نہیں بلکہ امکانات کے زاویے بھی بدل دیئے اور وہ تقلید کے دائرے سے نکل کر نئی منزلوں کی تلاش و جستجو میں مصروف ہو گئی۔ اس مرحلے پر غزل محض سر دھنے اور خول خوش کرنے والی چیز نہ رہی بلکہ افکار انسانی اور اذکار حیات و ممات سے مملو ہو گئی

اس میں جدت پسندی نیچرل انداز افادیت کا پہلو نمایاں ہو گیا تا ہم ان تمام نئے نئے امور کے باوجود بہتیرے شعراء نے روایت کی پاسداری کو برقرار رکھنے کی سعی وقوف کی ان میں اساتذہ سخن بھی تھے اور ان کے اکثر تلامذہ تھے چنانچہ حیدرآباد کی شاعرانہ فضاء میں قدیم وجدید غزل گوئی کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے جہاں غزل گوئی کا ایک ایک خاص طور طریق رہا جس میں محسوسات اور واردات کی عکاسی ہوگی تو دوسری جانب ترقی پسندی کے تحت ادب کی افادی کیفیات کو برتا جانے لگا۔ کچھ شعراء ایسے بھی تھے جنہوں نے قدیم طرز اظہار کو برقرار رکھا مگر خیالات و واقعات کی وسعت سے کبھی دامن کش نہ ہوئے انہی شعراء میں خواجہ ضمیر بھی ایک ہیں جنہوں نے اسی نہج اور اسلوب کو اپنے لیے مناسب ہی نہیں بلکہ احسن جانا ہے

ضمیر اہل سخن کو ذرا خبر کر دو!!	بنا رہا ہوں لہو سے غزل کی نوک پلک
یہ حسن کسی کا میری چشم انتخاب میں ہے	سما رہی ہے غزل در غزل کوئی آواز

صدائے ضمیر کے مطالعہ سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے اپنی طبع موزوں کو شاعری کے عین مطابق ڈھال لیا ہے جس میں تغزل کی اپنی اہمیت وجودت ہو گی جہاں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی کی حسین یکجائی نظر آتی ہے اس میں شاعرانہ تحقیق ہے اور تحریک وتاثر بھی ترنم و توازن کے علاوہ وجد او سرخوشی کے جذبات تسکین دلی پاتے ہیں مشہور انگریزی شاعر ورڈز ورتھ {WORD WORTH} نے جس چیز کو

STILL SAD MUSIC OF HUMANITY کہا ہے وہی خصوصیت ہماری غزل کی آفاقیت اور عنائیت کی روح رواں ہے اور شاعر کو دل و دماغ کی گہرائیوں تک پہونچانے کی ذمہ دار۔ خواجہ ضمیر کی غزل گوئی اسی کیفیت سے دوچار ہے ان کے ہاں وحدت خیال نہ ہوتے ہوئے بھی وحدت مزاج اور وحدت فکر کا عنصر ضرور ملتا ہے ان کی غزل میں موزونیت الفاظ کے ساتھ ساتھ جذبات روانی اور بے ساختگی نظر آتی ہے اور ان سب سے زیادہ شاعر کا طرز اسلوب میں خود اعتمادی کا پہلو نمایاں ہو گا ۔

تیغ چمکاؤ ذرا دار سجاؤ لوگو
فن کا انعام نہ فنکار کے سر کو ترسے

کانٹے ہیں کہیں سنگ کہیں آگ کہیں ہے
یہ راہ محبت ہے کچھ آسان نہیں ہے

ضمیر اکثر انہیں میں روشنی تقسیم ہوتی ہے
لہو جن کا چراغوں میں کبھی شامل نہیں ہوتا

خواجہ ضمیر ایک آگاہ و باخبر شاعر کی حیثیت سے ہمارے روبرو آتے ہیں ان کے ہاں زبان و بیان ہے۔ خیال بندی کا طریقہ بھی تشبیہ و استعارہ کا تیکھا پن انسانی احساسات کے اظہار کا قاعدہ اور خوب سے خوب کی تلاش و جستجو اپنی التہابی کیفیات کے باوصف ان کا لب و لہجہ مدھم مدھم سا لگتا ہے ان کے پاس نئے نئے تجربات کا ادراک نہیں ملتا۔ مگر روایت کی پاسداری کا قرینہ و سلیقہ واضح ہو گا۔ وہ قدیم و جدید قدروں سے واقف صداقت اور موزوں خلوص و انسانیت کے شاعر ہیں وہ غزل کے مزاج و مرتبہ کو مجروح ہونے نہیں دیتے جبکہ اپنی غزلوں میں یکسوئی و انہماک طرز استدلال کی روش کو اپناتے ہیں کہیں کہیں لطیف

ہ اور تمثیل استفادہ سے بھی کام لیتے ہیں اور اسی سے وہ انسان اور
ں مسائل حیات و کائنات کو اجاگر کرنے کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں انہوں نے
طراف و اکناف کے حالات، واقعات سے صرفِ نظر کرنا نہیں سیکھا تاہم
کے اظہار میں جذباتی رویہ نہیں اپنایا۔

تیرے غم کو لگا کے سینے سے
میری تقدیر مسکرائی ہے

آتشِ غم دل کی روشنی نظر آئی
میرے سرخ اشکوں کے ٹوٹے نگینوں میں

جو ساتھ رہ کے بھی تنہائی میں حائل ہو
وفا ترستی رہی ایسے ہمسفر کے لئے

عبارت مختصر : صدائے ضمیر کو ہم یقیناً ایک زندہ ضمیر کی آواز کہہ سکتے ہیں
ب وقت قاری اور سامع کو چونکا دیگی ۔ خواجہ ضمیر پر گو خوش کلام شاعر ہیں ۔
روں میں تحت اللفظ شعر پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں ۔ ان کے ہاں زندگی
ریں اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں جہاں تلخ و شیریں، پست و بلند
ا اور برے ہر طرح کے تجربات و احساسات ملتے ہیں، اور شاعر انہی حقائق کو
نایہ کے پیرہن میں ظاہر کر دیتا ہے ۔ میرا یقین ہیکہ ان کا یہ اولین انتخاب
ں حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ملک کے دیگر ادبی حلقوں میں بہ نظر استحسان دیکھا جائیگا۔
صدائے ضمیر کی اس اشاعت پر میں دلی مبارکباد دیتے ہوئے انہی کے اس
پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں ؎

ے دل میں نظر میں خیال و خواب میں ہے
میں کیسے سمجھوں کہ جلوہ ترا نقاب میں ہے

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
(ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی)

از منزل کنگ کوٹھی
3-5-780/18/ حیدرآباد اے پی

جناب نظیر علی عدیل

صدائے ضمیر میری نظر میں

بیشتر شعراء کے سلسلے میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ان کے فکری تجربے ہی ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہوتے بلکہ اظہار کی ہئیتیں بھی یکساں ہوتی ہیں۔ شاید یہ غزل کی صنف کا جبر ہے جو بہت جلد نئی ترکیبوں، اصطلاحات اور پیکروں کو بھی معمولات کے دائرے میں پہونچا دیتا ہے۔ اس کا ایک اور سبب شاعری کے پس منظر میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شعراء نے بعض حسّی اور فکری مسائل کے اظہار کو متنوع شاعری کے لئے اساسی درجہ دے دیا ہے۔ تنہائی، مستقبل کا خوف، گھر اور معاشرے کے بکھرنے کا احساس ہمارے عہد کے مسائل ہیں اور ان کے بیشتر پہلو ایک جیسے ہیں لہذا حالات کے ردِ عمل میں بھی کسی قدر یکسانیت کا ہونا ناگزیر ہے شاعری صرف بیان واقعہ کا نام نہیں کیونکہ یہ کام اخباروں کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے یہاں ضرورت اجتماعی تجربوں یا عام تہذیبی مسائل کو اپنے ذاتی اور انفرادی رویّے سے آمیز کرنے کی اور اپنے تخلیقی سفر میں اظہار اور ہیئت کی نئی

سموں تک پہونچنے کی ہے۔ مسائل اور موضوعات کے تعارف کے ہزار ول وسیلے ہیں لیکن سچی تخلیقی استعداد اپنے ہی باطن کی قوت اور شعور کی برکت و بصیرت کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے یہ دولت ہنر کمیاب ہے۔

جناب خواجہ ضمیر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صاف ستھرے اور منظم طریقے سے ان کے تجربات کے اظہار کا ہنر جانتے ہیں زبان و بیان کے رموز سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان پر قادر بھی ہیں جن کا بے ساختہ لہجہ اور نکیلا پن اچھی غزلوں کا مذاق رکھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شاعری بہ حیثیت مجموعی احساس کی زبان ہے جس کو فکر کی گہرائی، طرز بیان کے تنوع، ذاتی علائم اور شعر کی صحت مند روایات سے آراستہ کیا جائے تو ابلاغ میں پوری طرح کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ خواجہ ضمیر ابلاغ کی ضرورت کے اس طرح قائل ہیں ۔

اے بے خبر حقیقت کون و مکاں ہیں ہم
ہر شعبۂ حیات کی روحِ رواں ہیں ہم
بس اک ضمیر ہے مرا سرمایۂ حیات
لے چل بچا کے گردشِ شام و سحر مجھے

انہوں نے اس زمانے اور اس ماحول میں آنکھیں کھولیں جس زمانے اور ماحول میں صنفِ غزل تفریح طبع اور کرتب بازی کا شکار ہو چکی تھی اور اس سے غزل کے وہ اوصاف جو غزل کو جانِ سخن بنائے رکھتے ہیں ایک ایک

کر کے رخصت ہوتے جا رہے تھے' ایسے زمانے اور ماحول کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی احساس و فکر کو زندہ اور تابناک رکھنے کے لئے بڑی کاوش اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے ؎

اے ضمیر آواز تیری رہبر منزل بنی
جب کوئی آیا مسافر راستہ بھٹکا ہوا
تیرے غم کو لگا کے سینے سے
میری تقدیر مسکرائی ہے

شاعری کی آفاقیت کی راہ میں مذہبی ادراک اور شعور کی موجودگی ایک تجدیدی عنصر ہے۔ بہ الفاظ دیگر اچھی اور بڑی شاعری غیر مذہبی موضوعات ہی کی بنیاد پر وجود میں آسکتی ہے اس کی بھی کئی مثالیں ان کے پاس موجود ہیں ؎

حسن ہر تعمیر کا قائم ہے میری ذات میں
میں وہ مٹی ہوں مجھے چھانو تو کیا ملتا نہیں
ضمیر اکثر انہیں میں روشنی تقسیم ہوتی ہے
لہو جن کا چراغوں میں کبھی شامل نہیں ہوتا
آتش غم دل کی روشنی نظر آئی
میرے سرخ اشکوں کے ٹوٹتے نگینوں میں

خواجہ ضمیر شاعری کرتے ہوئے اب عمر کی اس منزل میں ہیں جو فکر کی پختگی اور زبان اور بیان کو سادگی عطا کرتی ہے۔ سیدھے سادھے اور

عام لفظوں میں کوئی بات کہی جائے تو وہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کو چونکا دیتی ہے ؎

لڑکھڑاتے ہیں جہاں لوگ محبت میں ضمیرؔ
ہم وہاں بھی ہیں قدم اپنے جمانے والے
زلزلے، طوفان، آندھی، گردشیں
اک تری چشم غضب کا نام ہے

شاعری کا یہ دور ادوارِ گذشتہ کے مقابلے میں بڑا نازک ہے اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو شعراء کی بہتات ہے دوسرے مجموعہ ہائے کلام کی بہ کثرت اشاعت ہے۔ مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کوئی بری بات نہیں۔ لیکن اس کے لئے کچھ وقت اور اصول مقرر ہیں۔ یعنی شعراء جب کہنہ مشق ہو جائیں اور ان کے پاس خاطر خواہ ذخیرہ کلام جمع ہو جائے تو مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت یقیناً ہونی چاہیئے اس کے برخلاف دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ایسے شعراء جن کی مشق سخن چار پانچ سال کی بھی نہیں ہوتی۔ ساٹھ ستر غزلوں پر مشتمل اپنے مجموعہ ہائے کلام چھپوا کر میدان میں کود پڑتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی نکاسی نہیں ہوتی اور وہ کتب فروشوں کی دوکانوں پر شوکیس کی زینت بنے ہوئے رہتے ہیں۔ دوکانوں پر کتابیں خریدنے کے لئے آنے والے نظر اٹھا کر تک انہیں نہیں دیکھتے۔ مجموعہ ہائے کلام کا یہ وہ حسرت ناک پہلو ہے جس کا احساس بہت جلد متعلقہ شعراء کو ہو جاتا ہے اور وہ دیمک کی غذا بنے

سے پہلے ان کو اپنے دوست احباب میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں جناب خواجہ ضمیر کے مجموعہ کلام "صدائے ضمیر" کے ساتھ ایسا حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ کیونکہ ایک تو وہ ادبی حلقوں میں کافی متعارف و مقبول ہیں۔ دوسرا ان کی مدت شعر گوئی کی مراعت کے ساتھ ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت کا اعلان جب اخبارات میں شائع ہوگا تو شائقین شعر و ادب یقیناً اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کو خرید کر پڑھیں گے۔

میں آخر میں انہیں "صدائے ضمیر" کی اشاعت اور اس کو ہر باضمیر تک پہنچانے کی کوشش پر مبارکباد دیتے ہوئے اپنی نیک تمنائیں وابستہ کرتا ہوں۔

(نظیر علی عدیل)

بیت النظیر
۲۳-۲-۱۹۰
مغل پورہ حیدرآباد آے پی ۵۰۰۰۰۲

ڈاکٹر سید عباس متقی

خواجہ ضمیر صاحب حیدرآباد کے ان گنے چنے شعراء
میں شمار ہوتے ہیں، جن کا کلام محض مشاعروں کے لیے وقف نہیں ہوتا
بلکہ انڈو پاک موقر رسالوں کی زینت بھی بنتا ہے۔ ضمیر صاحب کا کلام
سننے سے ایک خاص قسم کی مسرت ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت زبان کے
بھی شاعر ہیں اور بیان کے بھی، زبان کی مٹھاس اور ہی لطف دیتی ہے
تو لفظوں کا انتخاب اور ہی طرح محظوظ کرتا ہے۔ وہ یہ خوب جانتے
ہیں کہ کس مضمون کو کس انداز سے کہنا چاہیئے۔ کثرت مطالعہ اور قوت مشاہدہ نے
ان کی شاعری کو جلا بخشی ہے۔ فطری صلاحیت اور خداداد قابلیت سے کہ
وہ بے تکان کہتے چلے جاتے ہیں، غزل، نظم، رباعی، قطعات
مثنوی، مستزاد، ترجیع، بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس شاعری
کی وہ کون سی وادی ہے جہاں سے ضمیر نے آواز نہ دی ہو۔

ان کی شاعری ان کے جذبات کے آئینہ دار ہونے کے علاوہ ایک دنیا کے سبب درس اور وجہہ موعظت بھی قرار پاتی ہے۔

خواجہ ضمیر صاحب پیشہ کے اعتبار سے طبیب ہیں نفسیات کے علم نے انہیں اور بھی نباض بنا دیا ہے۔ طبع انسانی کے وہ پارکھ ہی نہیں معالج بھی ہیں۔ جسمانی امراض کے علاوہ روحانی، قلبی اور اخلاقی امراض بھی دور کرنے میں اپنی خدمات پیش کی ہیں اور بحمدللہ کامیاب رہے ہیں ' فی البدیہہ شعر کہنا جناب ضمیر کا خاصہ ہے اور یہی چیز انہیں ہم عصر شعراء میں ممتاز گردانتی ہے چنانچہ آل انڈیا ریڈیو سے جب فی البدیہہ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا تو جوہر نمائی کا گویا موقع ہاتھ لگا۔ شعراء نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔ خواجہ ضمیر صاحب نے فی البدیہہ مرصع غزل کہہ کر سامعین کو متاثر کیا اور شعراء سے دادِ تحسین حاصل کی۔ فی البدیہہ شعر کہنا انتہائی ذہانت اور قوتِ گویائی کا متقاضی ہوتا ہے اور ضمیر میں یہ دونوں چیزیں ودیعت ہیں۔

صاحبانِ ذوق کو یاد ہوگا کہ ایک مشاعرہ میں وہ معتمد تھے "شاعری" میں معتمدی فرما رہے تھے یعنی جب شاعر کو زحمتِ سخن دیتے تو ایک شعر فی البدیہہ جس میں شاعر مذکور کا نام ہوتا' نذر کرتے۔ اس سے ایک خاص قسم کی فضا بن گئی تھی۔

خواجہ ضمیر کم و بیش چالیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔

اور اب تک انہوں نے کئی مجموعے کہہ ڈالے ہیں، تاہم شکر ہے کہ اب ان کا ایک انتخاب شائع ہونے کی تمہید باندھ رہا ہے۔ ضمیر کی صلاحیتیں محض شاعری تک محدود نہیں بلکہ وہ لائق نثار بھی ہیں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور موضوع کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے جب انہوں نے میدانِ صحافت میں قدم رکھا تو وہ اس جولان گاہ کے بھی مرد قرار پائے اور "جذباتِ ضمیر" کے سرنامے سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا جو ایک دنیا کے لئے مہر درخشاں ثابت ہوتا لیکن حکومت کی عدم سرپرستی اور اردو والوں کی عدم دستگیری اور وسائل کی عدم فراہمی کے سبب بند ہو گیا۔

ضمیر نے شاعری اور طبابت اپنے والد بزرگوار حکیم میر حیدر رضا رحمت مرحوم سابق مہتمم شفاخانہ نظامیہ سے ورثہ میں پائی ہے۔ پہلے پہل انہوں نے اپنا کلام حکیم ثامن علی صاحب نیساں کو دکھایا جو اپنے وقت کے استاد تھے۔ زاں بعد محض اپنے بل پر شاعری کرنے لگے۔ سماع کی اکثر محفلوں میں قوال حضرات ضمیر کا کلام سنا کر داد تحسین و انعام کثیر پاتے ہیں اور مختلف غزل کو فنکار ساز پر ان کا کلام پیش کرتے ہیں۔

ضمیر فن عروض کی پابندی کو شاعری کی بنیاد متصور کرتے ہیں اور جو شاعری کے ضوابط عروض سے مبرا ہوتی ہے اسے شاعری نہیں سمجھتے اچھے شعروں کی وہ فراخ دلی سے داد دیتے ہیں اور تحسین میں خصوصیت

نہیں برتتے۔ ضمیر صاحب کو میر و غالب کے بے شمار اشعار ازبر ہیں۔ اساتذہ کے بیشتر کلام سے وہ گھنٹوں محفل کو گرم رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کے اعلیٰ شعری مذاق پر دال ہے۔ ضمیر نے قوم و ملت کا درد پایا ہے۔ قومی یک جہتی کے وہ علمبردار ہیں، یگانگت اور آشتی کے وہ شیدا ہیں۔ صلح پسند طبیعت پائی ہے۔ اختلاف و تنقید ان کے مزاج کی چیزیں نہیں۔ شہرت کی انہیں چاہ ہے نہ مقبولیت کی انہیں آرزو بلکہ وہ شہرت کو ایک طرح کی رسوائی سمجھتے ہیں تب ہی تو کہا ہے ؎

اے ضمیر اپنے کو ہرگز نہ نمایاں کرنا
شہرتِ عام بھی اک طرح کی رسوائی ہے

حالات سے سمجھوتہ کرنے اور مصلحت پسندی کو وہ ناپسند کرتے ہیں وہ شاعر ہی نہیں مدرس بھی ہیں، حق گوئی و بے باکی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ انہوں نے جو سوچا بعینہٖ لکھ دیا۔ تردد و تکلف سے وہ بری ہیں، یہاں ان کی ایک نظم کے چند مصرعے پیش کیے جاتے ہیں جس میں فیشن پرستی کو ہدفِ ملامت بنایا ہے ؎

لباسِ نو کے پردے میں متاعِ حسن عریاں ہے
نئے فیشن کی بے باکی پر چشمِ شرم حیراں ہے
کمر کی ہر لچک گویا حیاتِ نو کا عنواں ہے
ترقی کی یہ حالت دیکھ کے تہذیب گریاں ہے

نہیں جچتا کوئی حسنِ تقدس حسنِ خوباں پر
ہے داغِ بدنمائی چہرۂ تہذیبِ انساں پر

زبانِ اردو پر یوں تو کئی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے مگر ضمیر کی آواز اور ہی لطف رکھتی ہے، اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ۔

اردو

تو گلشنِ نظر میں ادب کی بہار ہے　　فکر و شعور و علم کی سرمایہ دار ہے
تیری جبیں سے حُسنِ غزل آشکار ہے　　دنیائے علم میں تو بڑی با وقار ہے
روشن تجھی سے غالب و چکبست کا ہے نام
دنیا میں سربلند ہے اردو تیرا مقام

ضمیر غزل کے شاعر ہیں ۔ اور غزل میں کلاسیکت کے ساتھ ساتھ نئے اسلوب اور نئے لہجے کو اپنی پہچان کا وسیلہ بنایا ہے، پامال راہوں میں بھی نئے گل کھلاتے ہیں، فکر انداز بیاں اور انتخاب لفظیات نے ان کی غزل کو ایک شان بخشی ہے وہ پرانی قدروں کی ایک لخت پر بھی نہیں ہوتے اور نئے دور سے دامن کش بھی نہیں، اس طرح کے امتزاج نے ان کی غزل کو دوسرے شعراء سے ممیز کیا ہے میں اپنی بات کی دلالت میں یہ چند شعر قارئین کی نذر کرتا ہوں ۔

خلوصِ دل سے ملو دوستو کبھی مجھ سے
میں ایک شمع ہوں لے جاؤ روشنی مجھ سے

میں نے سینہ سے لگایا اس کو بھلا دے دو تو
جو زمانے میں زمانے کا ہے ٹھکرایا ہوا

حیدرآبادِ دکن میں اب بھی اردو کی قسم
پرچم شعر و سخن ہر سو ہے لہرایا ہوا

نہ ملے گا کوئی اشکوں کے خریداروں میں
لے کے جاؤ نہ یہ موتی کبھی بازاروں میں

وہ ہزاروں میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں
نام جن کا نہیں چھپتا کبھی اخباروں میں

رہبری کا ان کو دعویٰ حیف ہے صد حیف ہے
دو قدم بھی اپنے قدموں پر جو چل سکتے نہیں

تجھ کو اہلِ انجمن نے اجنبی سمجھا ضمیرؔ
روحِ محفل تھا کبھی بیگانۂ محفل ہے آج

پڑھنے کا فن ہے تجھ میں تو چہرے کو پڑھ ضمیر
آواز دل کے چہرے کی تحریر بن گئی

میں اپنے بزرگ دوست جناب خواجہ ضمیر صاحب کی خدمت میں ان کی پہلو نٹھی تصنیف کی اشاعت تہہ دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور خدائے عزوجل سے ملتجی ہوں۔
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ڈاکٹر سید عباس متقی عفی عنہ

17-3-194/13
یثرب نگر۔ یاقوت پورہ
حیدرآباد ۔ ۲۳

الحاج مولانا محمد مظفر علی صاحب مدیر "صحیفہ"
(صدر آل آندھرا اردو نیوز پیپرس فیڈریشن)

تاثرات بر صدائے ضمیر

"صدائے ضمیر" کے مصنف جناب حکیم خواجہ ضمیر صاحب سے میری زائد از (۳۵) سال سے شناسائی ہے۔ یہ مولوی حکیم میر حیدر صاحب رحمت مہتمم شفاخانہ کے فرزند ہیں۔ مرحوم حکیم صاحب نہ صرف ماہر طبیب بلکہ نامور ادیب وشاعر گذرے ہیں۔ جناب حکیم خواجہ ضمیر کو علم و ادب وشعر وسخن ورثہ میں ملا ہے موصوف ہر صنفِ سخن میں شعر کہنے کی کامل صلاحیت رکھتے ہیں۔ صحیفہ بلڈنگ میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ محفل شعر و ادب میں مشہور زمانہ شاعر و ادیب پروفیسر ڈاکٹر شاذ تمکنت نے صدارت فرمائی تھی۔ اس کانفرنس میں مشاہیرِ حیدرآباد کے علاوہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری جناب ہر بنواس لاہوٹی بھی شریک ہوئے تھے۔ جناب حکیم خواجہ ضمیر نے کلام سنا کر خوب داد وتحسین حاصل کیا تھا اور صدرِ محفل ڈاکٹر شاذ تمکنت نے ان کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالی تھی۔

بزمِ اکبر جس کی بنیاد والدِ بزرگوار بابائے صحافت، مخدومِ ملت حضرت مولانا مولوی محمد اکبر علی صاحب رح مدیر "صحیفہ" روزنامہ نے ۱۹۳۱ء میں ڈالی تھی۔ ۱۲ برس کے (۱۲) سال بعد حضرت ۳۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو اس جہاں سے کوچ فرمائے۔ آج تک بزم

قائم و جاری ہے، اس بزم کے زیر اہتمام ہر ماہ مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، جناب خواجہ ضمیر بھی برابر حصہ لیتے رہتے ہیں، ایک دہا قبل یہ بزم کے معتمد بھی رہے۔
غزل ہو یا نظم، سلام ہو یا منقبت و نعت یا حمد، رباعیات ہوں، قطعات، جناب خواجہ ضمیر کا اسلوب بیاں خصوصیت کا حامل محسوس ہوا اور سامعین پر اثرانداز پایا گیا۔ ان کے اشعار میں نہ صرف شوکت لفظی ہوتا ہے بلکہ دل کو موہ لینے والی کیفیت بھی سامعین کے دل و دماغ پر اشعار کا کیف دیر تک باقی رہتا ہے۔
موصوف کا کلام میری نظر سے گذرا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک کتاب کا مضمون اپنے میں سمولیا ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ صاحب تصنیف کا کلام نہ صرف مقامی اخبارات و رسائل میں شائع ہوا ہے بلکہ بیرون ریاست مشہور جرائد و اخبارات نے کلام شائع کرکے سراہا ہے، یہ کہا جائے تو نادرست نہ ہوگا جناب ضمیر صاحب بے پناہ صلاحیت رکھنے کے باوجود تہی دست رہے، بہت پہلے ہی وہ اپنے کلام کو چھپوانا چاہتے تھے مگر ایسا نہ ہوسکا، اب بمشکل اس کو زیور طباعت سے آراستہ کرسکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قدر داں اس مجموعۂ کلام کی قدر و منزلت فرمائیں گے۔

پیش بارگاہ خدمتِ اُردو زباں رہی
ان کا کلام طالبِ انعام کیوں رہے (مظفر)

محمد مظفر علی
مدیر "صحیفہ"

صحیفہ بلڈنگ۔ اعظم پورہ
حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

یہ عرضِ حال میرا صدائے ضمیر ہے
یعنی عطائے رحمتِ ربِّ قدیر ہے

خدا کا شکر ہے کہ آج میرا پہلا شعری مجموعۂ کلام بنام "صدائے ضمیر" ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں، میرا شعری سفر تقریباً چالیس سال سے جاری ہے لیکن قارئین حضرات کی خدمت میں یہ میرا پہلا شعری مجموعۂ کلام ہے۔ مخلصان فکر و نظر و پرستاران شعر و ادب کے ذوقِ سلیم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان نامساعد حالات کے باوجود "صدائے ضمیر" اُردو اکیڈمی حکومتِ آندھرا پردیش کی اعانت سے پیش کر سکا ہوں۔

شاعری کیا ہے، تخلیقِ حقیقی اور ذاتی کدو کاوش کا نام ہے، حیات و موت کے مختلف پہلوؤں کو تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اجاگر کرنا اور بامقصد شعر کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

مجھے بیحد حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ بعض شعراء شاعری کی کثرت یعنی بسیار گوئی و مجموعوں کی اشاعت سے اپنے کلام پر اتراتے ہیں، اس لئے کہ انہیں قدیم فارسی و اردو اساتذہ کے کلام سے عدم واقفیت ہے۔ اساتذہ نے زبان کی لطافت و بیان کی نزاکت کے ساتھ ساتھ قادرالکلامی کا جو ثبوت دیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ میں ان کے آگے اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتا بلکہ

یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ گردِ پا بھی کہلانے کے لائق نہیں ہوں۔

(۳۵) سال قبل میرے استاذِ محترم حکیم و ڈاکٹر میر ضامن علی نیساں مرحوم کی سرپرستی میں پہلے پہل میں نے مشاعروں میں کلام سنانا شروع کیا تھا۔

میری شاعری میرے لطیف احساسات و جذبات کی عکاسی ہے میری شاعری میرے ٹوٹے ہوئے دل کی ترجمانی ہے۔ میں اس بات کو قارئین تک پہونچانا لازمی سمجھتا ہوں کہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کو اور زندگی کے مسائل کو اور سوچ و فکر کے بدلتے ہوئے زاویوں کو جب عمدگی سے پیش کرنا چاہتا ہوں تو خیالات آتش فشاں کی طرح اُبلنے لگتے ہیں، مگر علم کی کم مائیگی مانع ہو جاتی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کے کرم نے شاعرانہ فطرت عطا کی ہے اور خصوصیات بھی ودیعت فرمائی ہیں۔ جس کی بنا پر میں ایک شاعر کہلا رہا ہوں، میں نے اس طویل شعری سفر میں اپنے آپ کو کسی گروپ سے وابستہ نہیں رکھا اور نہ ہی کسی کو اپنے سے جدا سمجھا میں نے ہمیشہ اپنے سے سینئر شعراء کرام کا تہہ دل سے احترام کیا ہے اور نوجوان شعراء کی کافی حوصلہ افزائی کی ہے، میں جانتا ہوں کہ ہر شاعر اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق شعر کہتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ کی عطا ہو جاتی ہے تو مبتدی بھی منتہی سے بڑھ چڑھ کر شعر کہہ لیتا ہے، اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، ایسی بہت سی مثالیں دنیائے ادب میں موجود ہیں، میری شاعری محض تفریح کا سامان نہیں بلکہ حقیقت پسندی، انسان رواداری بنی نوع انسان کی ہمدردی، خلوصِ فکر عظمتِ حیات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس بات سے قارئین کرام ہرگز ہرگز یہ مطلب

نہ لیں میں احساسِ برتری کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنا مطمحِ نظر عرض کیا ہے۔ اگر میں اپنے معاصرین کا تذکرہ نہ کروں تو یہ ادبی خیانت متصور ہو گی۔ مگر میرے احباب بالخصوص شعراء برادری کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ میں فرداً فرداً نام لکھوں تو فہرست کافی طویل ہو جائے گی

حضرت سید شاہ احمد اللہ محمد محمد الحسینی صاحب ساجد بندہ نوازی (صحافی) نے "صدائے ضمیر" کی ترتیب واشاعت کے سلسلہ میں کافی تعاون فرمایا ہے جس کا میں شکر گذار ہوں۔

اُمید ہے کہ قارئین "صدائے ضمیر" پر ضرور کان دھریں گے اور اس جذبہ سے ضرور سرشار ہوں گے۔ "صدائے ضمیر" حق کی آواز ہے مجھے یقینِ کامل ہے کہ یہ آنے والی نسل کے لیے مشعلِ راہِ شعر و سخن ثابت ہو گی، عالمِ جہدِ مسلسل میں عصری آگہی کا شعور پیدا کرنے کی حتی المقدور کوشش تو کی ہے مگر اس کی کامیابی قارئین پر منحصر ہے۔

خلوصِ دل سے ملو دوستو کبھی مجھ سے
میں ایک شمع ہوں لے جاؤ روشنی مجھ سے

خواجہ ضمیر

حمد باری تعالیٰ

مختارِ دو جہاں ہے تُو ربّ قدیر ہے
بندہ ترا حقیر و فقیر و ضمیر ہے

ترا فضل ہو جائے جس پر خدایا
وہ قطرہ بنے اِک سمندر خدایا

ترا مِثل کوئی نہ ہمسر خدایا
تُو اعلیٰ تُو بہتر، تُو بڑھ کر خدایا

کہیں جُز، کہیں کُل ہے منظر خدایا
نہ سمجھا، سمجھ ہیں بھی آکر خدایا

ہم ایمان لائے ہیں تجھ پر خدایا
مُحمّدؐ کے کلمے کو پڑھ کر خدایا

عُدو کہہ نہ دیں ہم کو محتاج یا رب
کرم چاہیئے تیرا ہم پر خدایا

سوا تیرے دَر کے کہاں جائے بندہ
نہیں کوئی بھی تجھ سے بڑھ کر خدایا

تِری حمد کیا کر سکے کوئی بندہ
ہے قرآن تیرا ثنا گر خدایا

یہ فرشِ زمیں ہو کہ عرشِ بریں ہو
یہاں پر خدایا وہاں پر خدایا

تِری شان یکتا، تِری ذات یکتا
تُو بے رنگ ہے رنگ بن کر خدایا

تُو کافی تُو شافی تُو قادر تُو ناظر
حدِ عقل میں آئے کیوں کر خدایا

تُو اوّل تُو آخر تُو ظاہر تُو باطن
ہر اِک جا تُو ہی تُو ہے یکسر خدایا

نبیؐ کی محبّت رہے میرے دِل میں
ضمیر اس سے ہوگا منوّر خدایا

حمدِ پاک

ہر اک دستِ طلب کا مدعا تو
ہے حاجت مند کا حاجت روا تو

تری اس شانِ یکتائی کے صدقے — ہر اک میں رہ کے بھی سب سے جدا تو
ہماری ابتداء کیا انتہا کیا — ہماری ابتدا تو انتہا تو
تقیّد میں تجھے کس طرح لائیں — حدِ ادراک سے ہے ماورا تو
تجھے بھولیں تو بھولیں کس طرح ہم — ہمارا سب ہی کچھ ہے اے خدا تو
ترے محتاج ہیں دونوں ہی عالم — الٰہی مالکِ ارض و سما تو
صدائے بے صدا کو سننے والے — کبھی سن لے مرے دل کی صدا تو
نظر والوں نے دیکھا ہے ہمیشہ — ہر اک ذرہ میں ہے جلوہ نما تو

ضمیرؔ بے نوا کی التجا ہے
بڑھا اس کی طرف دستِ عطا تو

نعتِ شریف

وہ دل کیا جس کی دھڑکن نامِ احمد تک نہیں پہنچے
نظر وہ کیا جو اس نورِ مجرّد تک نہیں پہنچے

بہاریں خلد کی اس کے مقدّر میں نہیں ہوتیں
وسیلہ گر کسی کا سبز گنبد تک نہیں پہنچے

نبیؐ تو پھر نبیؐ ہیں جاں نثاروں کی یہ عظمت ہے
اُٹھے طوفان لیکن شمعِ مرقد تک نہیں پہنچے

محبت ہی نہیں ہے جن کے دل میں آلِ اطہرؑ کی
مرا دعویٰ ہے وہ فیضِ محمدؐ تک نہیں پہنچے

محمدؐ تک پہونچنا ہی خدا تک ہے پہنچ جانا
وہ کیا سمجھیں گے جو ایمان کی حد تک نہیں پہنچے

نہ ہو حبِّ نبیؐ تو علم ہوگا حرفِ بے معنیٰ
پڑھے قرآں مگر قرآں کے مقصد تک نہیں پہنچے

تجلّی گاہِ عالم میں فقط وحدت کی کثرت ہے
وہ کیا دیکھیں گے جو خود شوقِ بیحد تک نہیں پہنچے

نبیؐ کا نورِ باطن دیکھنے کی تاب کس میں ہے
نگاہ و فکر جب جسمِ مقیّد تک نہیں پہنچے

شبِ اسریٰ قدم کو چوم کر یہ عرش کہتا تھا
محمدؐ کے سوا کوئی مری حد تک نہیں پہنچے

مہ و انجم نے کی ہے جبہ سائی مدّتوں در پہ
مگر با وصف اس کے قربِ احمد تک نہیں پہنچے

ادب سے ذکر کر آرام گاہِ سرورِ دیں کا
یہاں روح الامینؑ دہلیز کی حد تک نہیں پہنچے

نبیؐ کی شان کو یہ فرش والے کس طرح سمجھیں
جب اہلِ عرش خود اس نور کے قد تک نہیں پہنچے

مقاماتِ محمدّ مصطفےٰ کو کیا وہ دیکھیں گے
غلامانِ محمدؐ کی ابھی حد تک نہیں پہنچے

اِدھر جلوہ، اُدھر پردہ، یہاں واصل، وہاں شامل
ضمیرؔ اس پہ بھی ہم میم مشدّد تک نہیں پہنچے

نعتِ شریف

آساں نہیں جائزہ شانِ محمدؐ
سمجھو تو مقامات غلامانِ محمدؐ

خورشید قیامت سے ملائے گا وہ نظریں — جو ذرہ ہو وابستہ دامانِ محمدؐ
ایماں نے بنایا ہے وضو اپنے لہو سے — ہے آلِ نبیؐ روحِ گلستانِ محمدؐ
ملتی ہے حیاتِ ابدی اس کو میاں سے — ہوتا ہے جہاں کوئی بھی قربانِ محمدؐ
ثابت ہے پسِ منظرِ لولاک لما میں — ہے انفس و آفاق پہ احسانِ محمدؐ
معراج میں چوما ہے قدم عرشِ بریں نے — اللہ رے اللہ رے یہ شانِ محمدؐ
ایمان مرا احمدِ مختار کا صدقہ — توحید کی اجرائی ہے فیضانِ محمدؐ

کیجئے نہ ضمیرؔ آپ کچھ اندیشۂ محشر
تھامے ہوئے رہیئے وہاں دامانِ محمدؐ

نذرِ میر تقی میرؔ
یوں تو دیکھے ہزاروں اہلِ سخن
تیری طرزِ بیاں نہیں ملتی
تیری غزلوں میں جو زباں ہے میرؔ
وہ کسی کو زباں نہیں ملتی

غزلیات

بے نقاط

سوکھ کر گل اگر کھلا ہوگا
اہلِ دل کا لہو ملا ہوگا

درد حد سے اگر سوا ہوگا — دردِ دل کی وہی دوا ہوگا
مسکرا کر الم سہا ہوگا — حوصلہ اس کا حوصلہ ہوگا
اگر احساس روح کا ہوگا — حدِ ادراک سے سوا ہوگا
وہ ہمارا ہے وہ ہمارا ہے — ہم کو اس کا ہی آسرا ہوگا
ورد اللہ کا کرو ہر دم — اس کا ہی دل کو آسرا ہوگا
گر ہو احساس سارے عالم کا — دل وہ دراصل کام کا ہوگا
دردِ دل آگ اور محرومی — ہم کو کس کس کا واسطہ ہوگا
مہکا مہکا ہے گھر کا گھر سارا — درسِ علم و عمل ہوا ہوگا

اس کی آمد اگر ادھر ہوگی
سوکھا سوکھا ہرا ہرا ہوگا

ہر سانس کر رہی ہے اقرار زندگی کا
کرتے ہیں پھر بھی ناداں انکار بندگی کا

ساقی ہے ہم سے باقی معیار میکشی کا
ہم نے کہاں کیا ہے اظہار تشنگی کا

کچھ درد ہے کچھ آنسو کچھ زخم ہیں کچھ آہیں
ہم نے سجا لیا ہے دربار عاشقی کا

کھل جائے گی حقیقت اپنا ہے یا پرایا
تم ذکر چھیڑ دینا اک بار دوستی کا

دیکھا ہے جس نے تجھ کو دیوانہ ہو گیا ہے
ہے دوست حسن تیرا شہکار دلکشی کا

تاریک زندگی میں تم چاند بن کے آؤ
دیدار ہے تمہارا دیدار چاندنی کا

للہ خود سے ملیئے پہچانئے گا خود کو
دروازہ کھٹکھٹا کر اک بار زندگی کا

سینچا لہو سے اکثر ہم نے ضمیر جس کو
شاداب ہو گیا وہ گلزار شاعری کا

اس طرح کچھ ہم ان کی نظر سے گذر گئے
جیسے کہ راہِ برق و شرر سے گذر گئے

کیا جانے کیا گذر گئی اربابِ عشق پر
احساس دورِ شام و سحر سے گذر گئے

اللہ کیا امیدوں کے طوفاں کا زور تھا
دو اشک میرے دیدۂ تر سے گذر گئے

اے تلخیٔ حیات ترے نشترِ الم
دل میں جگہ بنا کے جگر سے گذر گئے

پاسِ وفا ہے شکوۂ احساس کیا کریں
بادل ستم کے سینکڑوں سر سے گذر گئے

کیا ذکر دوست کا کوئی دشمن نہیں ملا
ایسی بھی ایک راہ گذر سے گذر گئے

کس درجہ سہل ہو گئی عزم و عمل کی راہ
جس وقت خوفِ راہِ سفر سے گذر گئے

اچھا ہوا چمن میں نشیمن نہ بن سکا
خوفِ نگاہِ برق و شرر سے گذر گئے

اب غم ہے کس کو گردشِ دوراں کا اے ضمیر
جب حادثاتِ شام و سحر سے گذر گئے

قدم قدم پہ ہیں کچھ خار رہگذر کے لئے
خوشا نصیب سہولت تو ہے سفر کے لئے

تجلیوں کی تمنّا تو عام ہے لیکن
شعورِ دید بھی لازم ہے کچھ نظر کے لئے

سرِ نیاز جھکانا تو سب کو آتا ہے
جبینِ دل کی ضرورت ہے سنگ در کے لئے

جو ساتھ رہ کے بھی تنہائی میں نہ حائل ہو
وفا ترستی رہی ایسے ہم سفر کے لئے

یہ کائنات طلسماتِ ہست و بود سہی
وجود رکھتا ہے ہر ذرہ دیدہ ور کے لئے

سحر ہوئی تو در و بام اجنبی ٹھہرے
لڑے تھے ہم کئی راتوں سے جس سحر کے لئے

جبیں جھکے تو اٹھے نقشِ آستاں لے کر
اک ایسا سجدہ ہی کافی ہے عمر بھر کے لئے

ضمیرؔ درد کو کیوں میرے دل کی یاد آئی
رہا نہ جب کوئی دامن بھی چشمِ تر کے لئے

بسطحِ آب ہیں اُبھرے ہوئے حباب کئی
تڑپ رہے نہ ہوں دریا میں پیچ و تاب کئی

ملی نہیں ہے کسی خواب کی مجھے تعبیر
مگر نگاہ نے دیکھے حسین خواب کئی

خبر بھی ہے تمہیں یارو کہ ناخداؤں نے
ڈبو دیئے ہیں سفینوں کو زیرِ آب کئی

خلوصِ دل سے پکارے اگر کوئی تجھ کو
ہر ایک سمت سے آنے لگیں جواب کئی

یہ کون رشکِ بہاراں یہاں سے گذرا ہے
پڑے ہیں راہ میں بکھرے ہوئے گلاب کئی

وہ ایک لمحہ خدا جانے کھو گیا ہے کہاں
حیاتِ شام و سحر نے کئے حساب کئی

بغور تم مری تصویرِ زندگی دیکھو
ملیں گے اس میں زمانے کے انقلاب کئی

ضمیرؔ ضبطِ غمِ زیست کا بھرم رکھئے
چھپائے بیٹھے تبسم میں اضطراب کئی

رُخ و گیسو کو ان کے جب دیکھا — صبح کو صبح شب کو شب دیکھا
نشۂ میخانہ کچھ عجب دیکھا — ہم نے ہر اک کو تشنہ لب دیکھا
ساتھ رہ کر بھی عمر بھر میرے — زندگی تو نے مجھ کو کب دیکھا
التفات اور بے رُخی کی قسم — لطف دیکھا ترا غضب دیکھا
ساری دنیا کو دیکھنے والے — اپنی ہستی کو تو نے کب دیکھا
تیری در پردہ ہر نہیں میں دوست — زلئیت کو موت کا سبب دیکھا
خود ہی کلیاں گلاب کی بکھریں — اک تبسّم جو زیرِ لب دیکھا
خود کو دیکھا نہ عمر بھر جس نے — کیسے سمجھوں کہ اس نے رب دیکھا
اشکِ غم خود ہی بن گئے موتی — جب تہی دامنِ طلب دیکھا

اس زمیں اور آسماں کو ضمیر
میں نے محوِ ثنائے رب دیکھا

تڑپا سکا نہ ایک بھی زخمِ جگر مجھے
دیکھے گا کوئی کس طرح با چشمِ تر مجھے

پھر کیا ڈرا سکے گی رہِ پُر خطر مجھے
خود آپ ہی بنالیں اگر ہم سفر مجھے

راہِ حیات میں نہ مرا ساتھ دے سکا
جس نے قدم قدم پہ کہا ہم سفر مجھے

نقشِ قدم کسی کے تصوّر میں آ گئے
پروا نہیں ملے نہ ملے سنگِ در مجھے

بس اک ضمیر ہے مرا سرمایۂ حیات
لے چل بچا کے گردشِ شام و سحر مجھے

جو شراب آنکھ سے چھلکتی ہے
وہ کہاں ساغروں میں ڈھلتی ہے

ان کے چہرے پہ زلف لہرائی
صبح کے ساتھ شام چلتی ہے

فرش کا کیا ہے عرش کانپ اٹھے
آہ دل سے اگر نکلتی ہے

ہم سفر ہو گیا ہے رہ جب سے
زندگی میرے ساتھ چلتی ہے

نہ تو جیتے ہیں نہ تو مرتے ہیں
جانے کب تن سے جاں نکلتی ہے

بعد مرنے بھی میرے مرقد پر
بے بسی شمع بن کے جلتی ہے

ان سے آنکھیں ملا رہے ہو ضمیر
جن کی آنکھوں میں برق پلتی ہے

کون ڈرتا ہے یہاں اب گردشِ ایام سے
ہم ہمیشہ ملتے آئے ہیں گلے آلام سے

کون سی آواز تھی دروازہ گھر کا کھل گیا
ہو گیا آباد آخر دل کسی کے نام سے

تیرا ملنا زندگی تیرا نہ ملنا موت ہے
کس قدر وابستہ ہے تو میری صبح و شام سے

آپ آئے ہیں سرِ بالیں جگانے کے لئے
تھک تھکا کر زندگی جب سو گئی آرام سے

میکشی پر میری ساقی رشک کرتے ہیں سبھی
پی رہا ہوں مست آنکھوں کے چھلکتے جام سے

سانس رکتی جا رہی ہے بجھتا جاتا ہے دل
سلسلے ملتے نہیں آغاز کے انجام سے

کون جانے زندگی دراصل کس کا نام ہے
نبض لیکن چل رہی ہے ایک تیرے نام سے

موت سے گھبرانے والے گیا جئیں گے اے ضمیر
موت بھی پائی ہے ہم نے زندگی کے نام سے

تم مری راہ پہ آجاتے تو اچھا ہوتا
کیوں ہر اک لغزشِ بے جا کا تماشا ہوتا

یہ بھی سوچا ہے کبھی تو نے بتا وقت پرست
وقت گر ساتھ نہ دیتا تو ترا کیا ہوتا

دیکھ سکتا نہیں تم کو رگِ جاں سے نزدیک
کاش خود میری نگاہوں کا نہ پردا ہوتا

وقت کی بات ہے اے حسنِ مسیحا پیکر
عشق بیمار نہ ہوتا تو مسیحا ہوتا

رہنمائی کے ہیں اجزاء مرے آب و گل میں
مٹ بھی جاتا تو ترا نقشِ کفِ پا ہوتا

یوں نہ ہوتے کبھی اربابِ محبت ناکام
کاش اظہارِ محبت کا سلیقہ ہوتا

فکرِ امروز میسر ہی نہیں جن کو ضمیر
دل میں کس طرح سے ان کے غمِ فردا ہوتا

ان کی نظروں میں محبت کے خزانے دیکھے
اسی آئینہ میں سو آئینے خانے دیکھے

جنبشِ لب پہ تسلی کے رواں تھے دریا
حق نگر آنکھوں میں رحمت کے خزانے دیکھے

عالمِ ہوش ترستا رہا تعبیروں کو
دیکھنے کو تو کئی خواب سہانے دیکھے

تیرا معصوم لڑکپن تیرا سنجیدہ شباب
ہم نے اے حسن تیرے دونوں زمانے دیکھے

صرف اک پردۂ دل میں ملی ان کی صورت
میری نظروں نے کئی آئینے خانے دیکھے

مر مٹے آپ پر بے نام فدائی کتنے
جن کو عنواں نہ ملا وہ بھی فسانے دیکھے

ان کے دامن میں مچلتے ہوئے اشکوں کا قسم
ہم نے بکھری ہوئی تسبیح کے دانے دیکھے

قیدِ ہستی کا جنہیں غم نہ رہائی کی خوشی
اس سلیقے کے فقط تیرے دیوانے دیکھے

رہنما اپنا سمجھتے تھے جو دیوانوں کو
ہم نے ہر دور میں ایسے بھی سیانے دیکھے

ضبطِ غم کا وہی انداز ضمیرؔ آج بھی ہے
گو بدلتے ہوئے ہر بار زمانے دیکھے

کہیں تماشہ نہ ہو اشک کی روانی سے
نکلتی دیکھی ہیں چنگاریاں بھی پانی سے

ڈرا نہ مجھ کو تو آلامِ زندگانی سے
گذر گیا ہوں کئی زخمِ ناگہانی سے

نہ عزم تو سے نہ ہمت نہ جانفشانی سے
ملے گی راہ فقط ان کی مہربانی سے

کبھی تو دیکھ لے رودادِ زندگی پڑھ کر
ہزاروں عنواں ملیں گے اسی کہانی سے

تجھے بھی موت میں چاہوں تو زندگی دے دوں
اگر ہے پیار تجھے میری زندگانی سے

ابھی ہے وقت ذرا کر لے خدمتِ انساں
تو کر نہ جائے سفر اس جہانِ فانی سے

ہر ایک لفظ دھڑکنے لگا ہے دل بن کر
بنامِ شعر مری فکر کی روانی سے

ہے دل میں عکسِ رُخِ یار کا حسیں جلوہ
ضمیرؔ اپنی ہے پہچان اس نشانی سے

سجدے قلب و نظر کے در پر ہیں
چشمِ بینا کے خم یہاں سر ہیں
ان کے ہاتھوں میں حق کے ساغر ہیں
پینے والے ترے مقدّر ہیں
سر چڑھاتے ہیں پھول کے بدلے
تیرے عاشق جنون پرور ہیں
ہر نفس میں خبر ہے جلوؤں کی
کون جانے کہ ہم کہاں پر ہیں
اللہ اللہ یہ فیض ہے ان کا
قطرے خود بھی یہاں سمندر ہیں
معرفت ہے کلام میں جس کے
اے ضمیرؔ آپ وہ سخنور ہیں

عشق کو جہاں میں مثلِ راہ بسر رکھا
بڑھ کے میرے قدموں پر منزلوں نے سر رکھا

اشکِ غم کو پیتا ہوں مسکرا کے جیتا ہوں
ضبط نے مرے آخر غم کو معتبر رکھا

کیا خبر سمٹ آئیں تیرے جلوے کب اس میں
شوقِ دل نے پھیلا کر دامنِ نظر رکھا

بجلیوں کے گرنے کا جس جگہ پہ خطرہ ہے
ہم نے آشیاں اپنا اس مقام پر رکھا

خواہشوں کو ہم یا رب کس طرح کریں پورا
زندگی تو دی لیکن وقت مختصر رکھا

ہے یہ تجربہ میرا خالقِ محبت نے
اہلِ عشق کے دل میں عشق کا اثر رکھا

ہم نے آس ملنے کی دل میں عمر بھر رکھی
تم نے وعدوں پر زندہ ہم کو عمر بھر رکھا

اے ضمیرؔ جلووں کا اک جہاں تھا نظروں میں
خود نگاہ نے لیکن ہم کو بے خبر رکھا

تاریکیوں میں نور سا پھیلا رہے ہیں ہم
ذرّوں کو کائنات کے چمکا رہے ہیں ہم

سمجھو تو آسماں کی بلندی بھی کچھ نہیں
سوچو تو کس کا نقشِ کفِ پا رہے ہیں ہم

آنسو گرے کہ غم کی امانت چھلک گئی
اظہارِ غم کے ساتھ ہی پچھتا رہے ہیں ہم

اے کاش زندگی کو میسر ہو لطفِ دید
اب تک اسیرِ وعدہ، فردا رہے ہیں ہم

اے عہدِ نو یہ سلسلہ جور تا کجا
کب سے حیاتِ شوق کو بہلا رہے ہیں ہم

ہم سے نہ وہ ملے کبھی ان سے نہ ہم ملے
یوں مثلِ رنگ و بو سدا یکجا رہے ہیں ہم

زینت لغت کی حرفِ حقیقت ہے اے ضمیر
باطل کا ہر فریبِ حسیں کھا رہے ہیں ہم

اس کو تاریخ کی پلکوں سے چنا جاتا ہے
حق کی خاطر جو سرِ دار چڑھا جاتا ہے

امتحاں اپنی وفاؤں کا لیا جاتا ہے
ہم کو رسوا سرِ بازار کیا جاتا ہے

عمر بھر آپ اُجالوں کے لئے ترسیں گے
اُٹھ کے محفل سے کوئی اہلِ وفا جاتا ہے

پست ذروں کے مقدر سے اندھیرا نہ گیا
اور اجالا سرِ مینار بٹا جاتا ہے

ہمدمِ خوابِ رہائی کی یہ تعبیر نہ ہو
آشیانہ جو بہاروں میں جلا جاتا ہے

آج کی شب یہ مری آخری شب ہے شاید
کیوں چراغ آج سرِ شام بجھا جاتا ہے

راستہ سوچ رہے ہیں ابھی اہلِ دانش
تیرا دیوانہ تری دھن میں چلا جاتا ہے

سُرخ آنچل میں رُخِ ز چھپا کر کوئی
اوڑھ کے خونِ تمنا کو چلا جاتا ہے

آپ جب آئیں گے کچھ بھی نہ رہے گا دل میں
خونِ دل اشکوں کے مانند بہا جاتا ہے

نہ ملی جب بھی گنہگار کو دنیا میں پناہ
تیرے دامن میں سمانے کو چلا جاتا ہے

روشنی سے کہیں محروم نہ ہو جائے ضمیر
کوئی سورج جو تصور سے ہٹا جاتا ہے

ان کے کوچہ میں عجب شانِ مسیحائی ہے
مرنے والے نے تو مر کے بھی بقا پائی ہے

تیری ہرجائی میں اک عظمتِ یکتائی ہے
تیری یکتائی پہ قرباں تیری ہرجائی ہے

زندگی آج مجھے ایسی جگہ لائی ہے
جس جگہ کوئی تماشہ نہ تماشائی ہے

دلِ صد چاک سے اشکوں سے شناسائی ہے
زندگی میرے قریب آ کے تو پچھتائی ہے

ہم نے اک ایسا گلستاں بھی دیا ہے ترتیب
برق چمکی ہے تو پھولوں کو ہنسی آئی ہے

خود مری ذات میں ہے عالمِ رویا پنہاں
اور ہوں گے وہ جنہیں شکوۂ تنہائی ہے

خوابِ غفلت سے اٹھو نیند کے مارو جاگو
کچھ خبر بھی ہے قیامت کی سحر آئی ہے

وہ مری آئینہ کاری کا ہنر کیا دیکھے
جس نے تقدیر سے پتھر کی نظر پائی ہے

کہہ دو الفاظ پرستوں سے کہ چہرہ پڑھ لیں
دل کی روداد نگاہوں میں سمٹ آئی ہے

ہنس کے پھولوں کی طرح کانٹوں سے مل کر دیکھو
شور اٹھے گا گلستاں میں بہار آئی ہے

ہم تو پروردۂ طوفاں ہیں ہمیں بچا لو!
اہلِ ساحل کو کہاں ہم سے شناسائی ہے

اے ضمیر اپنے کو ہرگز نہ نمایاں کرنا
شہرتِ عام بھی اک طرح کی رسوائی ہے

ساتھ رہ کے بھی یہ ڈر ہے نہ جدا ہو جاؤں
چاہتا ہوں ترے سایہ کی ادا ہو جاؤں

تجھ سے اس طرح قوی ربطِ محبت ہو جائے
میں ترے دل کے دھڑکنے کی صدا ہو جاؤں

کاش میں تیرے لئے راہِ وفا میں مٹ کر
عالمِ ہوش میں تمثیلِ وفا ہو جاؤں

وادیٔ عشق کے آلام میں جینا ہے کمال
یہ تو آسان ہے جب چاہوں فدا ہو جاؤں

کاروانوں کو ملے گا تری منزل کا نشاں
میں اگر راہ میں نقشِ کفِ پا ہو جاؤں

اس قدر تیری رضا پیشِ نظر ہے میرے
زیست سے بھی تری خاطر میں خفا ہو جاؤں

ان کی اک ادنیٰ توجہ کی ضرورت ہے ضمیرؔ
سربلندی میں فلک سے بھی سوا ہو جاؤں

میں نہیں شمس اور قمر کے لئے
یہ تو ہیں میری رہگذر کے لئے

تو کہاں ہے ہر اک نظر کے لئے
تیرا جلوہ ہے دیدہ ور کے لئے

زادِ راہ کی مجھے نہیں پروا
نور ہے ساتھ بس سفر کے لئے

اللہ اللہ وہ کیسا جلوہ تھا
بوسے آنکھوں نے خود نظر کے لئے

غم پہ اوروں کے جو تڑپ جائے
درد وہ چاہیئے جگر کے لئے

خاک سمجھیں گے عظمتِ انسان
جی رہے ہیں جو لعل و زر کے لئے

ایک پل بھی نہ وہ ملا مجھ سے
دل ملا جس سے عمر بھر کے لئے

میں کسی جلوے کو بھی کیا دیکھوں
جلوے خود ہیں مری نظر کے لئے

جو بصیرت نواز ہوتے ہیں
وہ ترستے نہیں سحر کے لئے

رگِ افکار سے لہو ٹپکے
ہے یہی امتحاں ہنر کے لئے

دارِ فانی میں کچھ نہیں ملتا
ہم مقامِ حیات ہر کے لئے

ہر نفس میں باخبر ہو جلووں کی
غیر ممکن ہے ہر بشر کے لئے

تو ہنر پر نہ ہو کبھی نازاں
عیب پیدا ہوا ہنر کے لئے

آئینہ گر ہے آئینے میں ضمیر
دعوتِ فکر ہے نظر کے لئے

اک لفظِ محبت نہ ہوا جن سے رقم بھی
دعویٰ نہ کریں وہ کہ ہیں ہم اہلِ قلم بھی

ہو جائے نہ بیکار وجود اور عدم بھی
جینا ہے تو رکھنا ذرا جینے کا بھرم بھی

وہ رہبرِ منزل بنے نسبت تری پا کر
چلنا نہیں آتا تھا جنہیں ایک قدم بھی

اے زندگی تحریر تری ختم نہ ہو جائے
آئی ہے اجل ہاتھ سے لینے کو قلم بھی

اغیار کا احسان اٹھانا نہ پڑے گا
ہیں دل کو دکھانے بہت احباب کے غم بھی

اے اہلِ جہاں بے سر و ساماں نہ سمجھنا
حاصل ہے مجھے دولتِ نسبت کا بھرم بھی

دیکھو تو الٹ کر کبھی اوراقِ بہاراں
ساحل بھی ہے دریا بھی ہے اور تم بھی ہو ہم بھی

غزلوں کو کبھی عشق کی آواز میں ڈھالو
تم ساز جو بن جاؤ تو پھر سوز ہیں ہم بھی

زندہ ہے ضمیر اک اسی نسبت کی بدولت
ہے سر پہ مرے آپ کا دامانِ کرم بھی

راہی کوئی نہیں ہے کوئی رہنما!
جس راہ پر چلا ہوں کہیں نقشِ پا نہیں

سجدے مرے زماں و مکاں سے ہیں بے نیاز
کعبے سے بتکدے سے کوئی رابطہ نہیں

دل ہے کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں
اے شیخ تیرا ایک بھی سجدہ روا نہیں

بے کیف سی ہے رات تو بے لطف سا ہے دن
سچ تو یہ ہے کہ جینے میں کچھ بھی مزا نہیں

شام و سحر بہار و خزاں رنج و انبساط
کوئی بھی انقلاب کی زد سے بچا نہیں

تنقید کر رہے ہیں وہ اشعار پر ضمیر
شعر و سخن سے جن کو کوئی واسطہ نہیں

جو اپنے آپ جی لے وہ کسی قابل نہیں ہوتا
نہ ہو انسانیت کا درد جس میں دل نہیں ہوتا

جسے ہو زعمِ آگاہی کبھی کامل نہیں ہوتا
شکستہ پا مسافر رہبرِ منزل نہیں ہوتا

خدا کا نام لینا سعیٔ لاحاصل نہیں ہوتا
مسافر لاکھ طوفانوں میں بے ساحل نہیں ہوتا

اگر ہو حوصلہ تجھ میں تو کیا اے دل نہیں ہوتا
تمنا غم کے طوفانوں سے بھی مشکل نہیں ہوتا

نہیں کہتے ہم اس در کو سخی کا در نہیں کہتے
جہاں پر ہاتھ پھیلایا ہوا سائل نہیں ہوتا

نظر والوں کو ہر جلوہ نظر آتا ہے قدرت کا
یہاں پر کوئی پردہ بیچ میں حائل نہیں ہوتا

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں وہ پی جاتے ہیں غصے کو
یہ مشکل کام بھی ان کے لئے مشکل نہیں ہوتا

ترا قاتل تو چھپ کر وار کرتا ہے سدا تجھ پر
جو تیرے سامنے آجائے وہ قاتل نہیں ہوتا

ہمارا حوصلہ دیکھو وفورِ غم میں ہنستے ہیں
ہماری گفتگو میں غم کبھی شامل نہیں ہوتا

تلاطم آشنا ہوں مجھکو طوفانوں نے پالا ہے
میری کشتی نہیں ہوتی مرا ساحل نہیں ہوتا

تمہیں ہر حال میں وہ دیکھ کر پہچان لیتا ہے
تمہارا چاہنے والا کوئی غافل نہیں ہوتا

ضمیر اکثر انہیں میں روشنی تقسیم ہوتی ہے
لہو جن کا چراغوں میں کبھی شامل نہیں ہوتا

اے بے خبر حقیقتِ کون و مکاں ہیں ہم
ہر شعبۂ حیات کی روحِ رواں ہیں ہم
کیوں کر کہیں کہ آپ کے جلوے نظر میں ہیں
سرگشتۂ خیال و قیاس و گماں ہیں ہم
پہونچے ہیں ہم کہاں تری تصویر دیکھ کر
تو کیا سمجھ سکے گا کہاں تھے کہاں ہیں ہم
مدّت ہوئی بہارِ چمن سے چلی گئی
گذری ہوئی بہار کی اک داستاں ہیں ہم
خوفِ خزاں چمن میں تھا یادِ بہار بھی
صحرا میں بے نیازِ بہار و خزاں ہیں ہم
وہ دن بھی تھے کہ راہ برِ کائنات تھے
یہ دن بھی ہیں کہ گردِ پسِ کارواں ہیں ہم
دنیا کا ہر چمن ہے ہمارا چمن ضمیرؔ
اہلِ چمن سمجھتے ہیں بے آشیاں ہیں ہم

یہاں انساں کو اپنا غم نہیں ہے
شعورِ عظمتِ آدم نہیں ہے
ہزاروں منزلیں تخلیق کرلیں
مگر عزمِ سفر محکم نہیں ہے
بھلا کیا لذتِ غم مل سکے گی
تبسم گر شریکِ غم نہیں ہے
عبادت مسخ ہے، بے روح سجدے
وہ سجدہ کیا اگر دل خم نہیں ہے
مرا ذوقِ جنوں بھی تھک گیا ہے
ترا عالم بھی وہ عالم نہیں ہے
نظر ہو تو پڑھو چہروں کی تحریر
نمایاں ہے کہیں مدھم نہیں ہے
کہو ٹکرائیں تو ٹکرائیں کس سے
ضمیرؔ ان حادثوں میں دم نہیں ہے

آرہی ہے اُن کی میرے قلب پر تنویر پر
آہ پہلی ضرب ہے یہ عشق کی تعمیر پر
دفعتاً ٹھہریں نگاہیں میرے لب تقریر پر
بات ٹھہری جب کبھی تفسیر در تفسیر پر
منظرِ حسن و محبت کس قدر دلکش ہے دیکھ
سایہ افگن ہیں مری نظریں تری تفسیر پر
ہمنشیں بہتر یہی ہے روک لے اپنی زباں
دل ہے برہم مصحفِ احساس کی تفسیر پر
کھینچ کر لائی انہیں آہِ محبت دیکھئے
رشک کرتا ہے زمانہ پھر مری تقدیر پر
اے اسیرِ ظلم تیرے خون کی تحریر نے
روشنی ڈالی ہے اک اک حلقۂ زنجیر پر
ان کے جلوؤں میں یکایک میری نظریں کھو گئیں
رو پڑا میں اپنی چشمِ شوق کی تقدیر پر
آج کل ہے آپ کا نامہ بھی مجھ سے ہمکلام
وہم ہوتا ہے مجھے تقریر کا تحریر پر
ابتدا سے مبتلائے درد ہوں یوں تو ضمیرؔ
پھر بھی کیوں الزام رکھوں کاتبِ تقدیر کا

کامیابی فضلِ رب کا نام ہے
حسنِ ظن حسنِ طلب کا نام ہے

صبح تیرہ شام دھندلائی ہوئی
کیا یہی اب روز و شب کا نام ہے

میں پرستارِ جنونِ دہریت
ہر زبانِ حال رب کا نام ہے

کیا مرتب داستانِ غم کروں
آپ کے لب پر طرب کا نام ہے

رنگِ گل رنگِ چمن رنگِ بہار
آپ کے رخسار و لب کا نام ہے

کتنے ہیں جو آشیاں رکھتے نہیں
اہلِ گلشن میں تو سب کا نام ہے

زلزلے طوفاں آندھی گردشیں
اک تیری چشمِ غضب کا نام ہے

علم و دانش سے سوا ہے اہلِ ہوش
شاعری فیضانِ رب کا نام ہے

کیا وہ سمجھیں لذتِ دردِ حیات
جن کے ہونٹوں پر طرب کا نام ہے

جس کو کہتے ہیں سبھی خواجہ ضمیر
خادمِ شعر و ادب کا نام ہے

آستانے ویراں ہیں دل کہاں ہیں سینوں میں
ایک سجدۂ حق کا دم نہیں جبینوں میں

ہم شمار کرتے ہیں وقت کے حسینوں میں
تم فلک نشینوں میں ہو کہ دل نشینوں میں

ایک بھی قدم ہم تو بے محل نہیں رکھتے
گو نہیں توازن اب درد و غم کے زینوں میں

آتشِ غمِ دل کی روشنی نظر آئی
میرے سرخ اشکوں کے ٹوٹتے نگینوں میں

جن کی نکتہ چینی میں ذاتیات شامل ہوں
فن کی آبرو کیا ہو ایسے نکتہ چینوں میں

کس طرح وہ طوفاں پر فتح پائیں گے آخر
ڈوب جائیں دل جن کے خود بخود سفینوں میں

تم ضمیرؔ زندہ ہو مسکراؤ ہر غم پر
یہ بھی اک قرینہ ہے عشق کے قرینوں میں

وہ اپنا ہے کہ بیگانہ سے سمجھا نہیں برسوں
عجب انداز سے دل میں رہا میرے مکیں برسوں

غزل سن کر مری کیا بات ہے اے ہم نشیں برسوں
حسد کی آگ میں جلتے رہے ہیں نکتہ چیں برسوں

بہارِ فکر بن آ رہا ہوں تیری محفل میں
رہے گی میری خوشبو تیری محفل کے قریں برسوں

نظر اپنی کبھی محرم جلوہ ہو نہیں سکتی
ملا ہر موڑ پہ ہم سے کوئی پردہ نشیں برسوں

زمانے سے ڈراتے کیا ہو مجھ کو کون ڈرتا ہے
یہی تو زمانہ جو رہا زیر نگیں برسوں

خدا شاہد نظر آئے کئی چہرے نگاہوں کو
مگر تجھ سا نہیں دیکھا کوئی ہم نے حسیں برسوں

زبانِ گل نے کی ہے یہ دعا رنگیں عبارت میں
رہے محفوظ ذہنوں میں غزل کی یہ زمیں برسوں

تجھے دیکھا تو منزل کا یقیں آنے لگا دل کو
نہ دیکھا تھا تجھے تو دور تھا دل سے یقیں برسوں

جنونِ عشق میں یارب ہماری اس طرح گزری
رہا ہے چاک دامن پرزے پرزے آستیں برسوں

نہ جانے کیا نظر آیا جو سجدہ کر لیا میں نے
کبھی کے سامنے تو خم نہ ہوئی تھی جبیں برسوں

ضمیرؔ اس آہِ دل کو مل بہا میں اپنے چھپا رکھا
رہے گی کھلبلی وہ سر عرشِ بریں برسوں

عمر بھر ہم جو تری اک نظر کو ترسے — ایسا کوئی نہ محبت کے اثر کو ترسے

تیغ چمکاؤ ذرا دار سجاؤ لوگو — فن کا انعام نہ فنکار کے سر کو ترسے

آپ کا فیض تو ہے عام زمانے میں مگر — کس لئے میری جبیں آپ کے در کو ترسے

دشتِ غربت میں ہے وہ کرب و بلا کا عالم — گھر میں رہتے ہوئے جیسے کوئی گھر کو ترسے

یہ اسیری یا رہائی ہے بتا دے صیاد — ہم جو آزاد ہوئے جنبشِ پر کو ترسے

ہم تو اٹھ جائیں گے اور اٹھ کے چلے جائیں گے — کل تری بزم نہ پھر اہلِ ہنر کو ترسے

خونِ دل خونِ جگر ہم نے دیا گلشن کو — جب بہار آئی تو اک غنچۂ تر کو ترسے

آپ آئے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو — گھر یہ وہ گھر ہے جو دیوار کو در کو ترسے

روئے تاباں ہے تصور میں شب و روز ضمیرؔ
ہم کہاں روشنیٔ شمس و قمر کو ترسے

دردِ دل دردِ جگر اور بڑھایا نہ کرو
ہم کو دیوانہ محبت میں بنایا نہ کرو

روئے روشن پہ کبھی زلف کا سایا نہ کرو
صبح کو شام سے اس طرح ملایا نہ کرو

آئینہ دے کے دمِ مرگ مرے ہاتھوں میں
زیست کی آخری تصویر دکھایا نہ کرو

سر جھکائے ہیں تو پھر دل بھی جھکانا ہوگا
ورنہ سجدہ میں فقط سر کو جھکایا نہ کرو

پیار، اخلاص سے غیروں کو بھی اپنا کر لو
آپ اپنوں کو بھی نفرت سے پرایا نہ کرو

بزمِ احباب میں آیا ہوں چلا جاؤں گا
میری خاطر کبھی تکلیف اٹھایا نہ کرو

وہ جب آتے ہیں تو بجھ جاتے ہیں محفل میں چراغ
سامنے ان کے چراغوں کو جلایا نہ کرو

دل سے تم مجھ کو بھلائے تو چلو یوں ہی سہی
شرط یہ ہے کہ خیالوں میں بھی آیا نہ کرو

گوشِ دل سے سنو آجائے جو آوازِ ضمیر
حق کی یہ بات ہے تم اس کو دبایا نہ کرو

جلووں میں ان کے خود کو مٹا کر تلاش کر
بعدِ فنا بقا کا کوئی گھر تلاش کر

بندہ اگر ہے شانِ قلندر تلاش کر
اٹھ جائے مردہ جس سے وہ ٹھوکر تلاش کر

جو روح کو جگا دے وہ منظر تلاش کر
پردے میں ہے یہاں جو وہ منظر تلاش کر

ساحل تلاش کر نہ سمندر تلاش کر
طوفان خیز موج کا منظر تلاش کر

ہر در پہ سر جھکانا ہے توہینِ بندگی
جس در پہ دل کو جھکنا ہے وہ در تلاش کر

پیراک سے کہو کہ سمندر اگر ملے
گہرائیوں میں ڈوب کر گوہر تلاش کر

ناز و نیاز کا یہ تقاضا ہے آج بھی
سودا ہے جس میں عشق کا وہ سر تلاش کر

محفل میں جس سے نور ہو وہ ہے چراغِ دل
تو اس کی روشنی کو نہ در در تلاش کر

پیتے ہی جس کو کھلتے ہیں اسرارِ دو جہاں
اس میکدہ کا ساقی وہ ساغر تلاش کر

خاصانِ رب تو ملتے نہیں ہر جگہ کبھی
ان کو عوام سے ذرا ہٹ کر تلاش کر

کانٹوں کا یہ وقار خزاں کی یہ آبرو
سازش ہے اس میں کس کی سنبھل کر تلاش کر

اک بحرِ بیکراں کو جو کوزے میں کر دے بند
ایسا کسی کا اک دلِ مضطر تلاش کر

اے باغباں تو مجھ کو اگر جانتا نہیں
کس کا لہو ہے پھولوں کے رخ پر تلاش کر

تیری صدا میں کس کی ہے آواز اے ضمیر
اک بار اپنے آپ سے مل کر تلاش کر

ہم سہارا اک شجر سے مانگ کر پچھتا گئے
ہم پہ اب اپنے حریف آرا چلانے آ گئے

ہم سے مت پوچھو کہ ہم کیا کھو گئے کیا پا گئے
اک تمہارے غم کی خاطر ہر خوشی ٹھکرا گئے

حق پرستوں کا یہاں پر کرنے استقبال لوگ
فرشِ گل کے نام پر کانٹے بچھانے آ گئے

صبحِ نو کی روشنی ہے ہر طرف پھیلی ہوئی
آپ کہتے ہیں اندھیرے زندگی پر چھا گئے

عظمتِ انسانیت بیمار ہو کر رہ گئی
خود پرستی کی وبا کچھ لوگ یوں پھیلا گئے

خشک ہونٹوں سے تبسم کی توقع ہے فضول
کھل نہیں سکتے کبھی وہ پھول جو مرجھا گئے

حوصلے اپنے جواں ہیں اپنی ہمت ہے بلند
حادثوں کا تذکرہ کیا راستے گھبرا گئے

ہو گیا آسان مرنا آج اپنے شہر میں
آپ جب سے قتل کو بھی خودکشی سمجھا گئے

ان کا جینا ان کا مرنا قابلِ تعریف ہے
خوابِ غفلت سے جو ذہن و فکر کو چونکا گئے

زندگی اے زندگی تیرا خدا حافظ ہے آج
وہ تسلی دے کے غم کی آگ کو بھڑکا گئے

خونِ دل اپنا ہے ان روشن چراغوں میں ضمیر
انجمن در انجمن جو روشنی پھیلا گئے

ہے فکر دل کو اگر آئینہ بنانے کی
نظر میں خاک رہے ان کے آستانے کی

یہ مختصر مری روداد ہے فسانے کی
جہاں میں رہ کے بھی خواہش نہیں زمانے کی

چلی تھی بات چمن میں جو آشیانے کی
فلک سے آئی خبر بجلیوں کے آنے کی

چمن میں آج اجالا دکھائی دیتا ہے
الٰہی خیر ہو اب میرے آشیانے کی

میں جان و دل کو ابھی فرش راہ کر دوں گا
خبر ملے تو سہی مجھ کو ان کے آنے کی

نہ فکرِ جیب و گریباں نہ ہوشِ داماں ہے
تو خود ہی دیکھ لے حالت ترے دیوانے کی

جو بات میں نے سنائی تھی برسرِ محفل
ضمیرؔ بن گئی وہ داستاں زمانے کی

انقلاباتِ جہاں کی کون سی منزل ہے آج
زندگی خود زندگی کے واسطے مشکل ہے آج

کون اپنے قافلہ کا رہبرِ منزل ہے آج
ہر قدم پر زندگی کی راہ میں مشکل ہے آج

جائزہ نیکی بدی کا کچھ تو لینا چاہیئے
آج باطل حق ہوا ہے اور حق باطل ہے آج

تجھ کو اہلِ انجمن نے اجنبی سمجھا ضمیر
روحِ محفل تھا کبھی بیگانہ، محفل ہے آج

آپ ہی دل ہیں اور نظر ہیں آپ
میں نے دیکھا جدھر ادھر ہیں آپ

منزلیں خود ہی ہو گئیں آساں
میں ہوں راہی تو راہ بر ہیں آپ

دونوں عالم کی سیر کرتا ہوں
ھر نفس میرے ہم سفر ہیں آپ

کیا اندھیرے ڈرائیں گے مجھ کو
سامنے میرے جلوہ گر ہیں آپ

دنیا والے جو مسکراتے ہیں
کیا محبّت کی راہ پر ہیں آپ

چاند تارے سلام کرتے ہیں
رات دن میرے ہم سفر ہیں آپ

سب کو اپنی طرح سمجھ بیٹھے
باخبر ہو کے بے خبر ہیں آپ

گرنے والوں کو تھام لیتے ہیں
دردمندوں کے چارہ گر ہیں آپ

یہ کشش ہے ضمیرِ الفت کی
ہم جدھر ہو گئے ادھر ہیں آپ

تمہاری جفا کاریاں اور بھی ہیں
ہماری وفاداریاں اور بھی ہیں

حسینوں کی دلداریاں اور بھی ہیں
محبّت کی غمخواریاں اور بھی ہیں

ہماری خطا کاریاں اور بھی ہیں
تمہاری طرفداریاں اور بھی ہیں

سفر زندگی کا کچھ آساں نہیں ہے
یہ راہوں کی دشواریاں اور بھی ہیں

لہو دے کے شاداب رکھا ہے جن کو
خیالوں کی وہ کیاریاں اور بھی ہیں

جہاں پیچ و خم ان کی زلفوں میں ہوں گے
وہاں پر گرفتاریاں اور بھی ہیں

کہیں شہرتِ عام رسوا نہ کر دے
مرے فن کی خودداریاں اور بھی ہیں

نہ سمجھا کبھی تو نے جذبِ محبّت
دلوں کی فداکاریاں اور بھی ہیں

ذرا پی کے مخمور آنکھوں سے دیکھو
ضمیر ان کی سرشاریاں اور بھی ہیں

جذبۂ عشق میں اتنا تو اثر ہو جائے
جو ادھر حال ہوا ہے وہ ادھر ہو جائے

غمِ دنیا کا اثر ہی نہیں ہوتا کوئی
فکر پابندِ غمِ دوست اگر ہو جائے

جب بھی آ جائے مرے سامنے وہ پیکرِ حسن
ہر نظر اس کی محبت کی نظر ہو جائے

شبِ ہجراں تو بہت طول ہوئی جاتی ہے
تم تصوّر میں بھی آؤ تو سحر ہو جائے

خود ہی ہو جائے گی آسان ہر اک راہِ عمل
دل میں مضبوط اگر عزمِ سفر ہو جائے

کاش عبرت ہو چمن لوٹنے والوں کو ضمیرؔ
کھل کے ایک ایک کلی آج شرر ہو جائے

لاکھ ساحل نے کیا مجھ سے کنارا اے دوست
حوصلہ پھر بھی نہ میں نے کبھی ہارا اے دوست

صبحِ امید سے ہر شام کو بہلاتے ہوئے
میں نے ہر لمحے کو مشکل سے گذارا اے دوست

آرزوؤں کی نئی شمعیں جلانی ہونگی
پھر سے چھایا ہے زمانے پہ اندھیرا اے دوست

عظمتِ زیست کا احساس نہیں ہے ان کو
لے کے جیتے ہیں جو اوروں کا سہارا اے دوست

میں نے دیکھا ہے کہ پھر جاگ اٹھا میرا ضمیر
تیرے جلوؤں کا لئے رنگِ نظارا اے دوست

دیکھ کیسے عالم میں تیرے غم کے مارے ہیں
تیرگی کے بادل ہیں آنسوؤں کے دھارے ہیں

بن گئے محبت کے آج کتنے افسانے
آپ کی نگاہوں میں کیا حسیں اشارے ہیں

ان کی نوکِ مژگاں پر اشک کیا قیامت ہے
چرخ سے اتر آئے جیسے کچھ ستارے ہیں

حال وہ اگر پوچھے ہم یہ صاف کہہ دیں گے
بے جئے زمانے میں زندگی گذارے ہیں

آپ کی نظر بدلی یا پلٹ گئی قسمت
صرف یاد کے سائے زیست کے سہارے ہیں

حُسن کا تکبر بھی فیض ہے نگاہوں کا
شوقِ عشق نے گیسو حسن کے سنوارے ہیں

ہے ضمیر دل میرا منتظر اسی دن کا
مسکرا کے وہ کہہ دیں آنے دو ہمارے ہیں

الٹی ہو جاتی ہے تدبیر کوئی کیا جانے
کیوں بگڑ جاتی ہے تقدیر کوئی کیا جانے

ان لکھے حرف کی تحریر کوئی کیا جانے
جو نہ ظاہر ہو وہ تصویر کوئی کیا جانے

جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے خیالوں میں انہیں
ہائے اس خواب کی تعبیر کوئی کیا جانے

یوں تو سب لوگ مرے شعر سنا کرتے ہیں
غم کے احساس کی تفسیر کوئی کیا جانے

قوتِ بازو پہ کرتے ہیں بھروسہ لیکن
کس طرح بنتی ہے تقدیر کوئی کیا جانے

فرش کیا چیز ہے جب عرش ہلا دیتی ہے
کیسی ہے آہ کی تاثیر کوئی کیا جانے

دل کی اک ضرب پہ ہے آہ کی بنیاد ضمیر
میرے اس عشق کی تعمیر کوئی کیا جانے

کسی نے ایسی مجھے طرزِ زندگی دے دی
زباں آنکھوں کو ہونٹوں کو خامشی دے دی

وہ بادہ خوار ہوں جس کو نگاہِ ساقی نے
بڑے خلوص سے خود اذنِ میکشی دے دی

نہ دن کو چین نہ شب کو قرار ہے مجھ کو
تڑپ یہ کس نے محبت کی دائمی دے دی

اندھیرا آپ کی محفل میں اب نہ ہوگا کبھی
لہو سے ہم نے چراغوں کو روشنی دے دی

بنامِ عشق فقط اُن کے اک اشارے پر
ضمیر نے انہیں تحفے میں زندگی دے دی

لگا کر آگ ہم نے آشیاں میں
اجالا کر دیا ہے گلستاں میں

ہے کتنا حوصلہ عزمِ جواں میں
ثبوت اس کا ہے گردِ کارواں میں

اگر ہو ربط دل میں اور زباں میں
صداقت ہو گی ان کے بیاں میں

یہی ہے لالہ و گل کی زباں پر
مرا خونِ جگر ہے گلستاں میں

ہمارے آشیاں کے تذکرے پر
تڑپ پیدا ہوئی برقِ تپاں میں

میں اک تنہا مسافر رہ گیا ہوں
شکستہ کشتیٔ عمرِ رواں میں

کھٹک تو خار میں ہوتی ہے لیکن
چبھن گل کی نہ تھی میرے گماں میں

ہمارا خونِ دل دے دو چمن کو
بہار آجائے گی دورِ خزاں میں

مری مشکل پسندی کام آئی
مجھے منزل ملی آبِ رواں میں

نہیں طوفاں تو پھر یہ بات کیا ہے
سفینہ رک گیا موجِ رواں میں

نہیں معلوم شاید خود مکیں کو
کہ ہم پنہاں ہیں بنیادِ مکاں میں

ضمیرؔ اپنا اگر کچھ ساتھ دے دے
تو ہو گی کامیابی امتحاں میں

جب آنکھ کوئی پرنم نہ ہوئی جب زلف کوئی برہم نہ ہوئی
مانا کہ اندھیرا ہے لیکن یہ شام تو شامِ غم نہ ہوئی

بڑھتی ہی گئی الجھن دل کی اس پر بھی نمودِ غم نہ ہوئی
عالم ہے یہ ضبطِ غم کا مرے کیفیتِ چشم نم نہ ہوئی

میں حال کہوں تو کیسے کہوں ناکامی کا بربادی کا
تقدیر کے چکر بڑھتے گئے اور گردشِ دوراں کم نہ ہوئی

اشکوں کا بھی طوفاں بڑھنے لگا آہوں کی بھی آندھی اٹھنے لگی
احساسِ وفا کی شمع تو روشن ہی رہی مدھم نہ ہوئی

بے خوف و خطر ہر منزل سے بڑھتا ہی رہا میں آگے ضمیرؔ
صد شکر کہ راہِ فکر و عمل شرمندۂ پیچ و خم نہ ہوئی

ملاؤ مجھ سے نظریں میری جاں آہستہ آہستہ
چلاؤ دل پہ پھر تیر و سناں آہستہ آہستہ

جو دشمن تھے ہماری جاں کے کل تک زمانے میں
وہ ہوتے جا رہے ہیں مہرباں آہستہ آہستہ

ملا کر ہم سے نظروں کو وہ خود ہی مسکراتے ہیں
محبت ہوتی جاتی ہے عیاں آہستہ آہستہ

جمائے تھے محبّت کے جو نقشے دل میں مشکل سے
مٹے جاتے ہیں اب وہ بھی نشاں آہستہ آہستہ

کسی کو کیا خبر ہے اے ضمیر ان کی محبّت میں
گذرتی ہے مری عمرِ رواں آہستہ آہستہ

غم میں ڈھلتی جاتی ہے آج ہر خوشی اپنی
زندگی پہ روتی ہے آہ زندگی اپنی

جس نے کر دیا رسوا جس نے کر دیا برباد
اس سے کیا نبھے اے دل رسمِ دوستی اپنی

جب قدم اٹھاتے ہیں دور ہوتی ہے منزل
لے کے پھر کہاں جائے ہم کو بے خودی اپنی

آتشِ غمِ دوراں شعلۂ غمِ جاناں
میرے دل سے لیتے ہیں تابِ زندگی اپنی

لو خزاں کے پنجہ میں جاتے جاتے ہر غنچہ
آہ سرخ ہونٹوں کی دیا گیا ہنسی اپنی

کوئی دردِ دل میرا آج تک نہیں سمجھا
اے ضمیر کام آتی کاش شاعری اپنی

بول بالا رہے ساقی ترے میخانے کا
دور چلتا رہے بس بادہ و پیمانے کا

گر پلانا ہے تو بس اتنی پلا دے ساقی
ہوش باقی نہ رہے اپنے کا بیگانے کا

آتشِ عشق میں جل کر بھی نہ کی اف منہ سے
پیار کچھ ایسا بڑھا شمع سے پروانے کا

بے پیئے اڑنے لگے ہوش ہمارے ساقی
جب خیال آتا ہے ہم کو ترے میخانے کا

کیا بہاروں سے مسرت ہو مجھے بتلاؤ
نقشہ پھرتا ہے جب آنکھ میں ویرانے کا

دیکھنے والے کو دیکھا ہی نہیں ہے تو نے
حال سنتا رہا اوروں سے تو دیوانے کا

سرخیاں خوں رلائیں گی انہیں آج ضمیر
پڑھ لیں مضموں جو مرے عشق کے افسانے کا

اٹھایا ہے ہمیشہ ہنس کے بارِ زندگی میں نے
جنونِ شوق سے سیکھی ہے گویا آگہی میں نے

خوشی دل کی جو اشکِ غم میں اکثر ڈوب جاتی ہے
اسیرِ تیرگی دیکھی ہے گویا روشنی میں نے

وفورِ اشکِ غم میں حوصلے دل کے ابھرتے ہیں
کسی طرح نہ پائی ہمتِ دل میں کمی میں نے

تڑپ اٹھتی ہے بجلی صرف بنیادِ نشیمن پر
ہزاروں بار دیکھی ہے یہ ربطِ باہمی میں نے

کبھی غنچے کو ساقی کے پیا ہے بزمِ رنداں میں
بظرفِ دل کیا ہے یوں بھی ذوقِ میکشی میں نے

جبینِ شوق میں ہے آستانِ یار کا پرتو
ضمیرؔ اس طرح ڈھالے ہیں اصولِ بندگی میں نے

طوفاں میں نہ ہم زیرِ امواج رواں ہوں گے
جب حوصلے ابھریں گے خود عزم جواں ہوں گے

اس حسن کے جلوے جب ہر رخ سے عیاں ہوں گے
پردے بھی تنکا ہوں گے احساس گراں ہوں گے

وہ چشمِ تصور میں جب رقصِ کناں ہوں گے
نظارے محبت کے ہر سمت جواں ہوں گے

جب دورِ بہاراں میں خود برقِ تپاں ہوں گے
کس طرح چمن میں ہم بے نام و نشاں ہوں گے

اے گردشِ دوراں تو جی بھر کے ستا لینا
لیکن نہ کبھی بھی ہم مائل بہ فغاں ہوں گے

ہے شمعِ سخن روشن محفل میں ترے دم سے
یوں تو تری محفل میں سب اہلِ زباں ہوں گے

ہیں زہر شکن عشوے یہ ناز و ادا غمزے
کیا جانیے دل کتنے اب نذرِ بتاں ہوں گے

جذبات کے پردے میں چھپتے ہیں کہیں جلوے
جو دل میں نہاں ہوں گے نظروں سے عیاں ہوں گے

وہ ساتھ زمانے کے رہتے ہیں ضمیر اکثر
ہم اہلِ تمنا کے ہمراہ کہاں ہوں گے

جب محبت کی ابتداء ہو گی
ہر شبِ غم کی انتہاء ہو گی

ہم پہ جب آپ کی عطاء ہو گی
زندگی اپنی جاں فزاء ہو گی

آپ کی صرف اک نگاہِ کرم
میرے جینے کا آسرا ہو گی

آپ اپنا اگر مجھے سمجھیں
زندگی کس طرح فنا ہو گی

دین اس کی ضمیر کیا کہیئے
ہر طلب سے تری سوا ہو گی

پھر گھٹا سے پیام آ ہی گیا
میرے حصے کا جام آ ہی گیا
جذبۂ شوق کام آ ہی گیا
ان کا مجھ تک سلام آ ہی گیا
نظریں اٹھتی ہیں جام آتے ہیں
زندگی کا مقام آ ہی گیا
چاندنی لیکے میری دنیا میں
آج ماہِ تمام آ ہی گیا
میرے اشکوں کے لب پہ آج ضمیر
جانے پھر کس کا نام آ ہی گیا

دل میں تڑپ نگاہوں میں جلوہ لئے ہوئے
جیتا ہوں تیرے غم کا سہارا لئے ہوئے

یہ بھی ہے جبرِ عشق کہ محرومِ مرگ ہوں
زندہ ہوں زندگی کی تمنا لئے ہوئے

ان کا ہر اک خیال ہے ان کی ہر اک نظر
میرے مشاہدات کی دنیا لئے ہوئے

مدت سے پھر رہا ہوں محبت کی راہ میں
دستِ جنوں میں دامنِ صحرا لئے ہوئے

میری نگاہِ شوق ترے اعتبار پر
ہے زندگی فروز نظارا لئے ہوئے

اس رازِ زندگی کی اندھیروں کو کیا خبر
شامِ الم ہے غم کا اجالا لئے ہوئے

ان کی نظر ہے مرہمِ زخمِ سخن ضمیر
آئے وہ میرے غم کا مداوا لئے ہوئے

زندگی کیسے تجھے ساتھ میں لیکر نکلوں
موت کا حکم ہے تنہا میں سفر پر نکلوں

مجھکو کس طرح بھلائے گا بھلانے والا
اشکِ غم بن کے اگر آنکھ سے ڈھل کر نکلوں

کیا حقیقت کو سمجھتے مری اہلِ دنیا
میں وہ قطرہ ہوں جو وسعت میں سمندر نکلوں

پردۂ شاہد و مشہود اگر اٹھ جائے
کھول دے رازِ حقیقت جو وہ منظر نکلوں

میں جو بکھروں تو نظر آؤں ہر اک ذرہ میں
اور سمٹوں جو کہیں عشق کا محور نکلوں

جھوم اٹھے گی ابھی آپ کی محفل کی فضا
جاتے جاتے جو غزل کوئی سنا کر نکلوں

آپ کا نور ہے پنہاں مرے آب و گل میں
نقشِ پا آپ کا بن جاؤں تو رہبر نکلوں

دیکھتا ہوں اسے گھر بیٹھے تصور میں ضمیر
دیکھئے اس کو بھلا کیسے میں در در نکلوں

تو میرے دل میں نظر میں خیال و خواب میں ہے
میں کیسے سمجھوں کہ جلوہ ترا نقاب میں ہے

یکایک آگ لگا کر مرے نشیمن کو
خدا ہی جانے یہ کیوں برق اضطراب میں ہے

ان آنسوؤں کی حقیقت کوئی سمجھ نہ سکا
جگر کا خون مرے دیدۂ پُر آب میں ہے

ترا جمالِ مکمل ارے معاذ اللہ
نہ ماہتاب میں ہے اور نہ آفتاب میں ہے

نہ جانے رنگِ حقیقت کہاں ہے پوشیدہ
نگاہ آج بھی الجھی ہوئی سراب میں ہے

میں تیرے ہاتھ سے لوں جام کس لئے ساقی
تری نگاہ کی مستی کہاں شراب میں ہے

جو گل تھا رشکِ چمن وہ ہے دستِ گلچیں میں
جو دل تھا کام کا وہ حالتِ خراب میں ہے

سما رہی ہے غزل در غزل کوئی آواز
یہ حسن کس کا مری چشمِ انتخاب میں ہے

جلانی ہوگی تجھے شمعِ عزم لوکو ضیاؔ
گر زندگی ابھی تک ظلمتِ عذاب میں ہے

دو پہ حاضر ہیں بھلا زئیت کی قیمت کیا ہے
بے زر و مال کی دنیا میں حقیقت کیا ہے

آشیاں ان کا چمن ان کا ہے نکہت ان کی
جو نہیں جانتے گلزار کی قیمت کیا ہے

دکھ اٹھائے ہیں زمانے کے زمانہ ہے گواہ
کیا بتائیں کہ تیری چشمِ عنایت کیا ہے

سنگِ در کھینچ کے چلے آئے بوقتِ سجدہ
ورنہ اے زاہدِ ناداں یہ عبادت کیا ہے

کارفرما نہ ہو جب مقصدِ تعمیرِ حیات
پھر تری شاعری اے شاعرِ فطرت کیا ہے

ہم بھی خودداریٔ فطرت پہ بہت نازاں تھے
جب کہ واقف نہ تھے تکمیلِ ضرورت کیا ہے

چشمِ بینا ہی جب خیر سے نابینا ہو
پھر یہ احساسِ الم اشکِ ندامت کیا ہے

زندگی جہدِ مسلسل سے سنور جائے گی
اے گرفتارِ الم شکوۂ قسمت کیا ہے

زندگی درد سے معمور ہوئی اپنی ضمیر
ہم سے پوچھے کوئی احساسِ محبت کیا ہے

حیاتِ شوق کا عالم بھی ہے عجب عالم
نہ دائمی ہے خوشی جاوداں نہ لذّتِ غم

ترقیوں کے اجالے میں دورِ حاضر سے
میں پوچھتا ہوں کہاں ہے وہ عظمتِ آدم

درست وقت کی نبضوں پہ ہاتھ ہے اپنا
نہ جانے کیوں ہے ابھی زندگی کی لے مدّھم

کئی چراغ سرِ رہگذار جلتے ہیں
یہ کون چھوڑ گیا آج اپنے نقشِ قدم

تجلّیوں نے تری ہر فسوں کو توڑ دیا
ضمیر کھا نہ سکا پھر فریبِ دیر و حرم

ساقی یہ میکدے کا عجب انتظام ہے

مے ہے نہ رند ہے کوئی ساغر نہ جام ہے

ہر پیڑ برہنہ ہے نہ پتے نہ پھول ہے

اے باغباں چمن کا یہ کیسا نظام ہے

منزل تمام عمر عبث ڈھونڈتے رہے

جب نقشِ پائے یار ہمارا مقام ہے

پہلی سی ان کی ہم پہ توجہ نہیں رہی

دل کا سلام ہے نہ تنظر کا پیام ہے

کس وقت آپ آئے عیادت کے واسطے

جب کہ مریضِ غم کا ہی قصہ تمام ہے

ہے اب بھی وقت کر لے تو کچھ کام بے خبر

فانی جہاں میں صرف دو روزہ قیام ہے

اک سنگدل کو موم نہ کر پایا تو ضمیر

تیری صدا کے آگے تو ہر اک غلام ہے

ٹپکا ہے خونِ دل رگِ افکار سے ضمیر

روشن جہاں میں اس لئے میرا کلام ہے

جو مانگنا ہے مانگ یہ دربارِ عام ہے
بگڑی ہوئی بنانا اسی در کا کام ہے

خالی یہاں سے کوئی بھی لوٹا نہیں کبھی
یہ آستانِ پاک کا فیضانِ عام ہے

جائیں گے چھوڑ کر کہاں درِ آپ کا حضور
قدموں میں آپ ہی کے ہمارا مقام ہے

جو تیرے عشقِ پاک میں مٹ کر فنا ہوا
اس کی حیات گویا حیاتِ دوام ہے

جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں کائنات میں
تیرے بغیر سانس بھی لینا حرام ہے

یہ دل تمہارا جان تمہاری خدا گواہ
تم سے ہماری زندگی کی ہر اک صبح و شام ہے

جس کو بھی مانگنا ہے وہ مانگے ادب کے ساتھ
اس در کا فیض سارے زمانے میں عام ہے

اے پینے والے پی کے مقدر پہ ناز کر
ساقی ہے میکدہ ہے اور گردش میں جام ہے

راہوں میں پیچ و خم اگر آئیں تو غم نہیں
میرا ضمیر راہِ بر صبح و شام ہے

تصور بھی جہاں ساحل کا کچھ مشکل سے آتا ہے
سفینے کو سرِ طوفاں دُکھیا پہ چھوڑ جاتا ہے

دمِ سیرِ چمن جب کوئی غنچہ مسکراتا ہے
مجھے بے ساختہ تیرا تبسّم یاد آتا ہے

وفا کی سختیاں سب پر کبھی یکساں نہیں ہوتیں
زمانہ آدمی کو دیکھ کر ہی آزماتا ہے

ہوئی موقوف ان سے رسمِ ربط و ضبط مدّت سے
کبھی یاد آتی ہے ان کی تو غم آنکھیں دکھاتا ہے

بعنوانِ محبّت آج کوئی تیری محفل میں
زبانِ اشک سے افسانۂ ہستی سناتا ہے

قفس سے کتنی ہی مانوس ہو جائے نظر لیکن
چمن کے ذکر پر اپنا نشیمن یاد آتا ہے

ضمیر اکثر کوئی آواز دیتا ہے درِ دل پر
جہاں احساسِ تنہائی مسلسل سر اٹھاتا ہے

آدمیت جو کروٹ بدلنے لگی
ذہن شاعر میں یہ بات کھلنے لگی
زلف لہرا کے رخ پر مچلنے لگی
صبح کے دوش پر شام چلنے لگی
کھل گئے مجھ پہ اسرار غم دوستو
جب سے احساس کی شمع جلنے لگی
زندگی کے ارادے بدلنے لگے
ہر خلش شعلۂ غم اگلنے لگے
پھر ضمیرؔ آج کیوں بزم اغیار میں
ذکر میرا میری بات چلنے لگی

میں تمہارے گاؤں میں آتا ہوں تو کھو جاتا ہوں
اجنبی آپ ہی اپنے سے میں ہو جاتا ہوں

اب یہ دنیا مرے نزدیک نہیں آسکتی
میں تری دھن میں تری یاد میں کھو جاتا ہوں

بعد مدت کے جو آیا ہوں ترے کوچے میں
جانے کیا سوچ کے بے ساختہ رو جاتا ہوں

بسترِ گل کا ہی محتاج نہیں نیند مری
وقت پڑتا ہے تو کانٹوں پہ بھی سو جاتا ہوں

تری فرقت میں نکلتے ہوئے آنسو میرے
موتی ایسے ہیں کہ پلکوں میں پرو جاتا ہوں

تری پرچھائی سے کیا کام چلے گا میرا
لے تری ذات میں خود کو ہی سمو جاتا ہوں

دل کے آئینے میں اک عکس نظر آتا ہے
اپنی پہچان کو میں بھول کے کھو جاتا ہوں

کس نے سمجھا ہے مرا حوصلۂ ضبط ضمیرؔ
میں تو ہر غم کو تبسّم میں ڈبو جاتا ہوں

آنکھ والا ترے جلوہ کو ترستا ہی نہیں
دیدۂ کور ہے جس نے تجھے دیکھا ہی نہیں

آنکھ وہ کیا ہے اگر حسن کا جلوہ ہی نہیں
سر وہ کیا جس میں ترے عشق کا سودا ہی نہیں

اس کی محفل کا کبھی ذکر نہ کرنا ہمدم
جس کی محفل میں غمِ دل کا مداوا ہی نہیں

غیر تھا غیر ہے وہ غیر رہے گا اے دل
تو اسے اپنا سمجھتا ہے جو اپنا ہی نہیں

ہر قدم پر مجھے منزل کا نشاں ملتا ہے
عشق کی راہگذر میں کوئی دھوکا ہی نہیں

ہم جو چاہیں تو بدل سکتے ہیں رنگِ محفل
ہم کو محفل میں کسی نے ابھی سمجھا ہی نہیں

سرنگوں عظمتِ آدم ہے خدا خیر کرے
ہم کو اس دور میں جینے کا سلیقہ ہی نہیں

وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں دنیا والے
وقت کو تو نے بدلتے ہوئے دیکھا ہی نہیں

شمع کی شان ہے جلتے ہوئے پروانوں سے
حسن کس کام کا جب چاہنے والا ہی نہیں

زندگی بھر وہ بھٹکتا ہے اندھیروں میں ضمیر
شمعِ احساس کا گر دل میں اجالا ہی نہیں

بے نیازی نے سلامت تجھے رکھا ہے ضمیر
لبِ احساس پہ اک حرفِ تمنا ہی نہیں

ہم جو ہو جائیں گے آپ اپنے سے اک بار جدا
زندگی کے نظر آئیں گے پھر آثار جدا

ہم نے دیکھا ہے زمانے کو زمانے کی قسم
وقت بگڑا تو ہوئے ہم سے سبھی یار جدا

کاش پہچانتے یہ رازِ چمن اہلِ چمن
اک جگہ رہ کے بھی پھولوں سے رہے خار جدا

گردشِ وقت نے منظر وہ دکھایا ہم کو
کس طرح ہوتے ہیں گھر کے در و دیوار جدا

نظمِ میخانہ ہے محتاجِ توجہ ساقی
جام مینا سے جدا مئے سے ہے میخوار جدا

موت آئی تو بکھر جاتے ہیں اجزائے حیات
سازِ ہستی کے ہوئے جاتے ہیں سب تار جدا

کام آئی ہے سرِ حشر تری چشمِ کرم
ہو سکے لطف سے کب تیرے گنہ گار جدا

فرق ہوتا ہے جہاں ظاہر و باطن میں ضمیرؔ
ہم نے دیکھا کہ ہے گفتار سے کردار جدا

صبح پر شام چھا جائے گی دفعتاً ان کے رُخ پر جو گیسو بکھر جائیں گے

راستہ میں اندھیرا ہو جب ہر طرف رہروانِ محبت کدھر جائیں گے

اپنی منزل سے آنچل ہٹے گا نہ پھر پھول کی طرح عارض نکھر جائیں گے

جب جوانی کی تکمیل ہو جائے گی حُسن کے چند گوشے ابھر جائیں گے

کیا خبر تھی مجھے اس طرح یک بہ یک خون ہو جائیں گے دل کے ارمان سب

تیری خاموش نظروں کے نشتر سبھی میرے قلب و جگر میں اتر جائیں گے

خود ہی آساں سے آسان ہو جائیں گے راہِ الفت کے دشوار تر مرحلے

تم جو باہوں میں باہیں ذرا ڈال دو ہم کٹھن منزلوں سے گذر جائیں گے

دردِ دل آج حد سے سوا ہو گیا تو نہیں آیا ہونٹوں پہ دم آ گیا

وقت باقی ہے آ بے وفا جلد آ ورنہ دنیا سے ہم خود گذر جائیں گے

ان کو تڑپائے گا دردِ دل مدتوں آہ ہونٹوں پہ لہرائے گی دیر تک

مسکراتے ہوئے آ رہے ہیں مگر دیکھ کر مجھ کو باچشمِ نم جائیں گے

کس کو معلوم تھا اے ضمیرِ حزیں دل کے ارمان نکلیں گے کچھ اس طرح

آہ بن کے لبوں پہ ابھر جائیں گے اشکِ غم بن کے آنکھوں میں بھر جائیں گے

ان سے دل پر غم پنہاں کا اثر کیا ہوگا
جو ادھر حال ہوا ہے وہ ادھر کیا ہوگا

سب کے سب جلوۂ آغازِ سحر میں گم ہیں
کس کو معلوم ہے انجام سحر کیا ہوگا

ذرہ ذرہ پہ ہو جب خوفِ خزاں کا پہرہ
پھول پر فصلِ بہاراں کا اثر کیا ہوگا

راہ دشوار بھی ہو جائے یکایک آساں
وہ اگر ساتھ ہوں احساسِ سفر کیا ہوگا

تیرے اندازِ نظر ہی پہ ہیں نظریں سب کی
دیکھنا ہے ترا اندازِ نظر کیا ہوگا

جادۂ غم کے خم و پیچ سے ڈرنے والو
تم سے دنیا کا کوئی معرکہ سر کیا ہوگا

عیب کو وہ جو ہنر کہتے ہیں کہنے دو نیر
عیب ہر حال میں ہے عیب ہنر کیا ہوگا

ہزاروں بار سہی دورِ آسماں بدلے
مگر خدا نہ کرے چشمِ مہرباں بدلے

بتاؤ کیسے کوئی روحِ داستاں بدلے
زمانہ لاکھ محبت کی سرخیاں بدلے

ہزاروں بار گری برق آشیانے پر
وفا پرست عنادل نہ گلستاں بدلے

زمانہ لاکھ بدلتا رہا ہے رنگ اپنے
جبینِ شوق ہی بدلی نہ آستاں بدلے

متاعِ زیست ہے بے شک وہ ایک لمحۂ فکر
امید و یاس سے جب قلبِ ناتواں بدلے

سفینے ڈوبنے والے ابھر کے آئے ہیں
یہ تیرے طوفاں شکن حوصلے جہاں بدلے

خلوصِ وقت کے زخموں کا بن گئے مرہم
یہ داغ ہائے دل انجمن جہاں بدلے

بہار آ کے بھی نظمِ چمن بدل نہ سکی
یہ سچ ہے کوئی ذرا طرزِ باغباں بدلے

پلا رہا ہے نگاہوں کے جام سے ساقی
اے اہلِ بادہ کدہ طرزِ میکشاں بدلے

ضروریات نے لوٹا متاعِ قلب و نظر
فریبِ زیست نے جب عہدِ دوستاں بدلے

فسونِ دیر و حرم ہے ضمیرِ ذہنوں پر
زمانہ بیت چکا طرزِ امتحاں بدلے

بہار اپنی چمن اپنا نہ اپنا آشیانہ ہے
مگر گلشن میں باقی آج بھی اپنا فسانہ ہے

مصیبت میں خود اپنے بھی پرائے ہوتے جاتے ہیں
یہی دستورِ دنیا ہے یہی رنگِ زمانہ ہے

تقاضے اب نیاز و ناز کے کچھ رنگ لائیں گے
جبینِ شوق میری اور ان کا آستانہ ہے

ابھی میں صفحۂ ہستی پہ اک حرفِ تمنا ہوں
مرے اشعار کا مشتاق کیوں دورِ زمانہ ہے

سنا کر آج میں پچھتا رہا ہوں غم کا افسانہ
ہر اہلِ غم سمجھتا ہے یہ اپنا ہی فسانہ ہے

ضمیر آواز دیتا ہے مسلسل اے جہاں والو
خود اپنی سانس ہی اپنے لئے اک تازیانہ ہے

کہتے ہیں عشق کس کو ذرا لو لگا کے دیکھ
دیوانہ اپنے دل کو کسی کا بنا کے دیکھ

نزدیک آ کے دیکھ کبھی دور جا کے دیکھ
لیکن یہ شرط ہے اسے اپنا بنا کے دیکھ

تیرے مریضِ ہجر کا بچنا محال ہے
نسبت کو آج اپنی مسیحا بنا کے دیکھ

تو اس میں ہے وہ تجھ میں ہے کیا جانتا نہیں
ہے دیکھنا اسے تو خودی کو مٹا کے دیکھ

آجائے گی مرے دلِ ویراں میں پھر بہار
اک بار میری سمت ذرا مسکرا کے دیکھ

جلوہ جمالِ یار کا ہے روبرو ضمیر
آنکھوں پہ جو پڑا ہے وہ پردہ اٹھا کے دیکھ

ہم کو بدلے یہ زمانہ بھی تو کیونکر بدلے
بارہا ہم نے زمانے کے مقدّر بدلے

وقت بدلا تو یہ دیکھا ہے کہ اکثر بدلے
کوئی ایسا نہیں جو وقت کے تیور بدلے

میری ہستی میں ہیں موجود خزانے کتنے
جستجو میں مری ہر عہد نے دفتر بدلے

وہ سفر کیا ہے گزر جائے جو ساحل ساحل
رُخ ذرا کشتی کا طوفان کی زد پر بدلے

فکر اپنی نہ زباں اپنی نہ مضموں اپنا
پھر بھی محفل کو وہ رنگ اپنا جما کر بدلے

جگمگاتے ہوئے گھر سے یہ پتہ چلتا ہے
آپ آئے تو مرے گھر کے مقدّر بدلے

ایک قطرہ ہی سہی موت سے ڈرتے کب ہیں
ہم سمندر میں جو مل جائیں سمندر بدلے

تیرے دیوانوں کے قدموں میں تھی منزل ان کی
ہوش والے کبھی رستہ کبھی رہبر بدلے

ہیں چراغِ سرِ منزل کی طرح روشن ہوں
آئیں محفل میں تو محفل کا ہی منظر بدلے

جوشِ احساس یہ کہتی ہے تو دل کہتا ہے
پھول کے روپ کو دھارے ہوئے پتھر بدلے

اسی عالم میں ہے دنیا کا مسافر خانہ
اے ضمیرؔ آپ کہاں آج نیا گھر بدلے

رُخِ حسیں کو حضور آپ کے ادھر کر دو
ہمارے حال پہ اک پیار کی نظر کر دو
ترس رہی ہے اجالوں کو زندگی میری
جو ہو سکے تو شبِ غم کی بھی سحر کر دو
یہ مانتا ہوں نظر بے رخی کا خنجر ہے
تم اس کو مرہمِ زخمِ دل و جگر کر دو
رہو جہاں میں ہمیشہ ہی سرخرو بن کر
جو تم پہ آئے وہ الزام میرے سر کر دو
نظر کے ساتھ کئی جام رقص کرتے ہیں
بس ایک جام مرے نام عمر بھر کر دو
مجھے ہنر نہیں آیا زمانہ سازی کا
مزاج دارو مجھے واقفِ ہنر کر دو
بنا رہا ہوں لہو سے غزل کی نوک پلک
ضمیرؔ اہلِ سخن کو ذرا خبر کر دو

لٹا دی آپ کی خاطر متاعِ زندگی میں نے
بتا دیں آپ ہی انصاف سے کی کیا کمی میں نے
ہوا ہے کس طرح سودا نہ پوچھو ان کی الفت کا
سکونِ دل کو دے کر مول لی ہے بے کلی میں نے
مری الفت پہ شبہ ہے انہیں کو حیف ہے اے دل
کہ جن کے واسطے برباد کر لی زندگی میں نے
ہزاروں بار دیکھا آپ کی شانِ تبسم کو
ہزاروں بار دیکھیں بجلیاں چمکی ہوئی میں نے
ہمیشہ مجھ کو غم میں مبتلا رکھا زمانے نے
لبوں پر اپنے اک دن بھی نہ دیکھی ہے ہنسی میں نے
ستم سہتا رہا میں زندگی بھر اے ضمیرؔ اس کے
نبھانا تھا غرض مجھ کو نبھا دی دوستی میں نے

کب عشوہ و انداز کا پھر وار کرو گے
کب تیرِ نظر دل کے مرے پار کرو گے

تم میرے لئے میرے لئے میرے لئے ہو
تم میرے سوا کس سے کبھو پیار کرو گے

دل میرا تڑپتا ہے محبت میں تمہاری
کب مجھ پہ کرم اے مرے سرکار کرو گے

مر جاؤں گا مٹ جاؤں گا چاہت میں تمہاری
تم چاہ کا میری اگر اقرار کرو گے

تم میری محبت کا ذرا فیصلہ کردو
کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ انکار کرو گے

ہو جائے گی آسان ہر اک راہِ محبت
ملنے کے اگر راستے ہموار کرو گے

میخانے میں اک بوند کو ترسو گے ہمیشہ
شکوہ بھی دستور کا میخوار کرو گے

تم سیرِ چمن کے لئے آئے تو ہو لیکن
ہر پھول کو گلشن میں بہت خوار کرو گے

ہر ایک سمجھتا ہے ضمیر اب تمہیں اپنا
کس کس کی محبت کا تم اقرار کرو گے

ہر ایک گوشے میں برقِ تپاں کی بات چلی
چمن میں جب بھی مرے آشیاں کی بات چلی

پہونچ گیا سرِ منزل میں جس گھڑی اے دوست
رہِ حیات میں عزمِ جواں کی بات چلی

کہاں سے آ گئے آخر یہ رہروانِ غلط
کہ کارواں نہ چلا کارواں کی بات چلی

یہ سچ ہے چل نہ سکی دو قدم بھی عمرِ رواں
بہت دنوں مری عمرِ رواں کی بات چلی

غزل سنائی ہے ہم نے جہاں کہیں بھی ضمیر
وہاں ہمارے شعورِ بیاں کی بات چلی

پردہ داری کی یہ پابندی کہاں ہوتی ہے
پردہ داروں کی ملاقات جہاں ہوتی ہے

یوں تو ملنے کو سب احباب ملا کرتے ہیں
پھر بھی تنہائی مری آفت جاں ہوتی ہے

رقص کرتی ہیں خدا جانے بہاریں کتنی
مسکراہٹ جو ترے لب پہ عیاں ہوتی ہے

وہ تو کھولے ہوئے زلفوں کو چلے آئے ہیں
زندگی سوچ تری صبح کہاں ہوتی ہے

اک سخنور کا ہے اتنا ہی تعارف اے دوست
عظمتِ فکر و نظر اس سے عیاں ہوتی ہے

دیکھ لیتا ہوں تصوّر میں تمہارا جلوہ
آنکھ میری کبھی بے نور کہاں ہوتی ہے

بحرِ ہستی کی ہر اک موج کو رکنا ہوگا
کشتیٔ عمر مری آج رواں ہوتی ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ یاد نہیں کرتے ہیں
اہلِ فن کی کمی محسوس جہاں ہوتی ہے

آپ تنقید کسی پر بھی خدارا نہ کریں
اچھے لوگوں میں بری بات کہاں ہوتی ہے

آنکھ والا ہو تو پڑھ سکتا ہے چہرہ کو ضمیرؔ
دل کی ہر بات کہاں سب پہ عیاں ہوتی ہے

لو محبّت کی کچھ اس طرح لگائے رکھنا
ان کے جلووں کو نگاہوں میں سمائے رکھنا

ہم غلاموں کی صدا لاج نبھائے رکھنا
بات بگڑے نہ کہیں بات بنائے رکھنا

منزلِ شوق مری آپ کے قدموں میں ہے
اپنے قدموں سے بہر حال لگائے رکھنا

دونوں عالم اسی صورت میں نظر آئیں گے
اک تصوّر کو ذرا ان کے جمائے رکھنا

میری نسبت کی زباں پر ہے یہی شام و سحر
اپنے سائے میں ہر اک غم سے بچائے رکھنا

جانے کب جان تری تن سے نکل جائے ضمیر
یادِ محبوب کو سینے سے لگائے رکھنا

حصارِ دیر و حرم کو توڑ کر اے حسنِ جانانہ
زمانے میں اکیلا ہو گیا ہے تیرا دیوانہ

تری زلفوں کی خوشبو سے مہک جاتا ہے فرزانہ
جسے بھی چاہتی ہے تو بنا لیتی ہے دیوانہ

پلائے جا پلائے جا مرے ساقی پلائے جا
تری نظریں ہیں پیمانہ مری نظریں ہیں رندانہ

تمہاری یاد میں جینا تمہاری یاد میں مرنا
کوئی پوچھے تو کہہ دینا یہی شغلِ رندانہ

بتا اے زندگی تجھ کو کہاں اب لیکے جاؤں میں
وہ کعبہ ہے خدا کا گھر یہ ساقی کا ہے میخانہ

تیرے دیدار کا عالم نہیں معلوم کیا ہوگا
فقط تیرے تصوّر سے ہے روشن میرا غمخانہ

کئی حسرت کئی آنسو کئی آہیں سمٹ آئیں
ضمیر اب ہو گیا آباد میرے دل کا کاشانہ

ہم نے سوچا ہی نہیں گلشن یہ کس کے نام ہے
خونِ دل خونِ جگر دینا ہمارا کام ہے

جینے والو کیوں لبوں پر شکوۂ آلام ہے
سعیٔ پیہم درحقیقت زندگی کا نام ہے

نبض ڈوبی سانس ٹوٹی آخری ہچکی لگی
اب ترے بیمار کو آرام ہی آرام ہے

زندگی اے زندگی کتنی ہیں تصویریں تری
تو کہیں بدنام ہے اور تو کہیں انعام ہے

مل گیا ہے مجھ کو جب سے ان کا دامانِ کرم
منزلِ مقصود اپنی آج زیرِ گام ہے

حوصلہ دل کا سلامت ہے تو مجھ کو غم نہیں
میرے آگے سرنگوں ہر گردشِ ایام ہے

اہلِ ایماں نے کیا ہے دل سے تیرا احترام
اے ضمیرِ انسانیت کا تو بڑا انعام ہے

جادۂ شوق کے ہر ذرہ کو منزل باندھا
ربط و نسبت کی قسم سجدہ کے قابل باندھا

میں نے اس درد کو پہلو میں جو رہ رہ کے اٹھا
اپنے ٹوٹے ہوئے ارمان کا حاصل باندھا

اپنی ہمت ہے کہ تعمیرِ نشیمن کے لئے
حوصلہ برقِ فروزاں کے مقابل باندھا

میں کہاں کشمکشِ وقت سے ڈرنے والا
موجِ طوفاں کو مرے عزم نے ساحل باندھا

ہجر میں اس ہی جینے کی جہاں ٹوٹ گئی
آپ کی یاد نے ہر سانس کو مشکل باندھا

غم کسی کا ہو مگر عکس نظر آتا ہے
دل کے آئینے کو آئینۂ ہر دل باندھا

ہر لبِ قافلہ افتادہ مسافر کو ضمیرؔ
ہم نے اڑتی ہوئی گردِ رہِ منزل باندھا

ہم نہ ہوں گے تو یقیناً تیرگی چھا جائے گی
دور ہو کر ہم سے دنیا ایک دن پچھتائے گی

بھولنے والے بتا میں کس طرح بھولوں تجھے
خود بخود صورت تری دل میں اترتی جائے گی

اے خدا تیرے سوا اب دینے والا کون ہے
کس کے آگے زندگی دستِ طلب پھیلائے گی

میں وہ راہی ہوں سفر تا حشر جاری ہے مرا
زندگی تو ساتھ میرے اب کہاں تک آئے گی

ہوش میں رہ کر نہ ڈھونڈو اپنی ہستی کا سراغ
سرحدِ ادراک سے گذرو تو منزل آئے گی

چھوڑ کر اپنے خدا کو زندگی در در نہ پھر
اس طرح کس کس کے آگے ہاتھ تو پھیلائے گی

فیض ہے چشمِ بصیرت کا کسی کی دوستو
ٹھوکروں میں خود ہے دنیا ہم کو کیا ٹھکرائے گی

عظمتِ انسانیت کی کیا حفاظت ہو سکے
زندگی جب زندگی کے نام سے گھبرائے گی

خموشیوں میں بھی لفظوں کا ایک دفتر ہے
نگاہِ وقت میں عہدِ وفا کا منظر ہے

نہ مجھ کو فکرِ جہاں ہے نہ خوفِ محشر ہے
تمہارا دستِ کرم اب بھی میرے سر پر ہے

گھٹا ہے زلف دہن غنچہ آنکھ ساغر ہے
جمالِ دوست تو رنگین غزل کا پیکر ہے

تمہارا حسن مجسم بہار ہے گویا
تمہارے سامنے شرمندہ ہر گلِ تر ہے

نہ کیفِ شام نہ صبحِ بہار کا منظر
تمہاری سانس میں پوشیدہ ایک نشتر ہے

کبھی تو آؤ ذرا تم غریب خانے پر
تمہاری راہگذر میں غریب کا گھر ہے

ہر ایک منزلِ مشکل سے میں گذر جاؤں
تو میرے ساتھ ہے اے دوست مجھ کو کیا ڈر ہے

تمہاری یاد نے بزمِ حیات مہکا دی
ہر ایک سانس میں خوشبوئے مشک و عنبر ہے

تمہارے نقشِ قدم کا یہ صدقہ ہے گویا
ہماری راہگذر آج بھی منور ہے

خیال و فکر کی شیشہ گری سے کیا حاصل
یقین دل میں نہیں ہے تو دل بھی پتھر ہے

نہ جائے میری غزل بے ہنر کی محفل میں
ہر ایک لفظ مرا مثلِ لعل و گوہر ہے

جگر کا خون دیا جس نے شاعری کو ضمیرؔ
اسی کے دم سے عیاں عظمتِ سخنور ہے

مانا کہ میں اسیرِ الم عمر بھر ہوا
لیکن ترے خیال سے کب بے خبر ہوا
یہ کس مقام پر مجھے لے آئی زندگی
جس سمت دیکھتا ہوں وہی جلوہ گر ہوا
ہر منزلِ حیات قدم چومنے لگی
جب سے ترا خیال مرا ہم سفر ہوا
اس کو پناہ مل نہ سکی کائنات میں
جو تیرے در سے اٹھ گیا وہ دربدر ہوا
جب سے خیالِ یار میں میں کھو گیا صفیر
اپنا خیال پھر نہ مجھے عمر بھر ہوا

ہم ہیں دیوانے وہ ہیں فرزانے
کس کا کیا حال ہے خدا جانے

پیاسے پیاسے ہیں خود ہی پیمانے
اجڑے اجڑے ہوئے ہیں میخانے

کیسے سمجھوں میں اجنبی خود کو
لوگ ملتے ہیں جانے پہچانے

ان کو سینے سے ہم لگاتے ہیں
جن کو ٹھکرا دیا ہے دنیا نے

چشم ساقی کی مہربانی سے
رقص کرنے لگے ہیں پیمانے

آپ کو وقت خود بتا دے گا
کون اپنے ہیں کون بیگانے

رسم کیسی ہے یہ محبت کی
آگ میں جل رہے ہیں پروانے

زندگی اے ضمیرؔ اس کی ہے
تیری آواز کو جو پہچانے

جذبۂ عشق بتا وقت وہ کیسا ہوگا
سامنے نظروں کے جب یار کا جلوا ہوگا

روئے روشن سے نقاب آپ اُٹھا کر دیکھیں
میری دنیا میں اجالا ہی اجالا ہوگا

ہم نے ہر راز کو سینے میں چھپایا لیکن
کس کو معلوم تھا یوں عشق کا چرچا ہوگا

تو نے صورت نہ دکھائی تو یہ صورت ہوگی
تیرے دیوانے کا محفل میں تماشا ہوگا

ہے ترا عکسِ حسیں میرے ہی دل میں پنہاں
تو نے یہ آئینہ شاید نہیں دیکھا ہوگا

اس کی پہلی ہی نظر نے کیا دیوانہ ضمیر
یہ ہے آغاز تو انجام بھلا کیا ہوگا

وہ آئے ہیں مرے گھر میں یہ تاثیرِ محبت ہے
کرم ہے مہربانی ہے نوازش ہے عنایت ہے

میں جب بھی آئینہ دیکھا تو تو ہی تو نظر آیا
یہ صورت ہو گئی ہے میری صورت تیری صورت ہے

تجھے خود میں سما کر اپنا جلوہ دیکھ لیتا ہوں
میری ہستی بجز تیرے نہ ہونے کی علامت ہے

تمہارا دیکھ کر جلوہ دلوں سے کرتے ہیں سجدہ
تمہارے عاشقوں کی بس یہی طرزِ عبادت ہے

خدا لازم اگر ٹھہرا تو پھر ملزوم ہے بندہ
اسے اس کی ضرورت ہے اسے اس کی ضرورت ہے

ضیاؔ اپنا تعارف کچھ ہو لیکن نام ان کا ہے
انہی سے زندگی ہے زندگی کو ان سے نسبت ہے

عجب رنگِ زمانہ ہے کیا کیا جائے
ہر ایک بس یہی کہتا ہے کیا کیا جائے

ہر ایک ذرہ میں جلوہ ہے حسن کا تیرے
مگر نگاہ یہ پردہ ہے کیا کیا جائے

میں تجھ اور تو مجھ میں ہے یہ حقیقت ہے
مگر یہ عشق تو رسوا ہے کیا کیا جائے

زمانہ ڈرتا تھا سایہ کو دیکھ کر جس کے
وہ اپنے سائے سے ڈرتا ہے کیا کیا جائے

سمجھ رہا ہے زمانہ جسے مرا قاتل
وہی تو میرا مسیحا ہے کیا کیا جائے

میں گردِ راہ نہیں ہوں چراغ منزل ہوں
تو مجھ کو چھوڑ کے بھٹکا ہے کیا کیا جائے

میں کیا بتاؤں کہ کیا کیا ہوا کیا کیا
تو صرف ہر گھڑی کہتا ہے کیا کیا جائے

جلا رہا ہے زمانہ کئی چراغ مگر
ہر ایک سمت اندھیرا ہے کیا کیا جائے

وہ تجھ کو جان کے بھی جانتا نہیں تجھ کو
وہ آنکھ رکھ کے بھی اندھا ہے کیا کیا جائے

ضمیرؔ زندہ رہے وہ بھی اس زمانے میں
ہر ایک کو خواہشِ دنیا ہے کیا کیا جائے

اک اجالا جو کوئی وقفِ نظر ہوتا ہے
مجھ سے پوچھو کہ وہی زخمِ جگر ہوتا ہے

دل پہ جب دردِ محبت کا اثر ہوتا ہے
جو ادھر حال ہوا ہے وہ ادھر ہوتا ہے

بزمِ احساس میں روشن ہے چراغِ امید
پھر بھی کیوں دل کا جہاں زیر و زبر ہوتا ہے

روئے تاباں پہ بکھر جاتی ہیں زلفیں جس دم
پردۂ شب میں نہاں نورِ سحر ہوتا ہے

چوٹ لگتی ہے جب احساسِ محبت پہ کبھی
فکرِ شاعر میں قیامت کا اثر ہوتا ہے

آپ رسوا ہوئے کس طرح محبت میں ضمیر
آپ کی بات میں جب حق کا اثر ہوتا ہے

دل کی روداد نگاہوں سے سنا دی جائے
ان لکھے حرف کی تحریر پڑھا دی جائے

کیا ہوئی ہم سے خطا پہلے بتا دی جائے
بعد جو آپ کا جی چاہے سزا دی جائے

میرے اشعار سے گونجی ہے صداقت کی صدا
ہو سکے تو مری پہچان مٹا دی جائے

سفرِ عشق میں ہے آبلہ پائی لازم
راہِ پُر خار کو گلزار بنا دی جائے

اشک تو غم کی امانت ہیں سنبھالے رکھنا
یہ وہ دولت تو نہیں ہے جو لٹا دی جائے

ڈال طوفان میں کشتی کو تو ڈرتا کیا ہے
کیا عجب غیب سے یہ پار لگا دی جائے

فرق کیا نظم و غزل میں ہے بتانے کے لئے
اے ضمیرؔ آج غزل اپنی سنا دی جائے

پایا ہے اہلِ دل نے اعزاز زندگی کا

کھلتا ہے اہلِ دل پر ہر راز زندگی کا

اس کی صدا جلائے ہر شمعِ آرزو کو

جادو اثر ہے ایسا یہ ساز زندگی کا

جینے کو جی رہا ہے تو جانتا کہاں ہے

انجام زندگی کا آغاز زندگی کا

اے آنے والے آجا اب بھی ہے وقت بچا

خاموش ہو نہ جائے یہ ساز زندگی کا

ہم سے ضمیر اکثر ہر حادثہ ملا ہے

ہم جانتے ہیں کیا ہے انداز زندگی کا

کرتے ہیں ہیرا ذکر سرِ انجمن ابھی
بھولے نہیں مجھے مرے اہلِ وطن ابھی

بدلا مزاجِ شاعری عصرِ جدید نے
باقی رکھا ہے ہم نے غزل کا چلن ابھی

بکھرے ہوئے پڑے ہیں کئی پھول راہ میں
گزرا یہاں سے کیا کوئی رشکِ چمن ابھی

گھبرا رہے ہیں آپ اندھیروں سے کس لئے
روشن ہے بزم میں مری شمعِ سخن ابھی

دل کے کھنڈر میں دیکھ دریا دکھول کر
محوِ کلام ہوگا کوئی سیم تن ابھی

حاصل اگر ہے چشمِ بصیرت تو دیکھ لے
موجود ہیں جہاں میں کئی اہلِ فن ابھی

اے دل سنبھل کے تلخ نہو طرزِ گفتگو
بیٹھا ہے پاس آکے وہ شیریں سخن ابھی

زندہ ضمیر لوگوں سے اک بار مل کے دیکھ
چمکے گی تیرے سامنے حق کی کرن ابھی

جب بھی قلم غزل پہ اٹھانا پڑا مجھے
احساس کا چراغ جلانا پڑا مجھے

ہر پردۂ حجاب اٹھانا پڑا مجھے
جب حوصلہ نظر کا دکھانا پڑا مجھے

ترکِ تعلقات کی منزل کے بعد بھی
اکثر اسی کے کوچے میں جانا پڑا مجھے

تاریک انجمن ہے چراغوں کے باوجود
شمعِ وفا کو خوں سے جلانا پڑا مجھے

خود مجھ سے مجھ کو مانگ لیا حادثات نے
اپنے ہی ہاتھوں خود کو لٹانا پڑا مجھے

خاموشیوں کو دے کے غمِ عشق کی زباں
پردے میں حالِ دل کا چھپانا پڑا مجھے

ملتا نہیں ہر ایک سے دل جانتے ہوئے
پھر بھی ہر اک سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

زندہ ضمیر ہے مرا یہ ظرف دیکھنا
دشمن کو بھی گلے سے لگانا پڑا مجھے

کوئی تیرگی میری اور نہ روشنی میری
تیرے دم سے چلتی ہے سانس ہر گھڑی میری

تجھ کو دیکھتے رہنا ذکر تیرا کر لینا
یہ ہے زندگی میری یہ ہے بندگی میری

کتنے جام چھلکے ہیں سامنے نگاہوں کے
شکر ہے سلامت ہے اب بھی تشنگی میری

آپ اپنی محفل سے پوچھ کر ذرا دیکھیں
کیا کبھی ہوئی پوری بزم میں کمی میری

ظاہری چمک پر ہے اب نظر زمانے کی
سب میں کر گئی رسوا مجھ کو سادگی میری

کوئی رازِ دل میرا آج تک نہیں سمجھا
اے ضمیرؔ کام آئی کاش شاعری میری

اہلِ دل سے حالِ دل آپ کیوں چھپاتے ہیں
یہ توکل کی باتوں کو آج ہی بتاتے ہیں

حوصلہ زمانے کو اس طرح دکھاتے ہیں
بجلیوں کی زد پہ ہم آشیاں بناتے ہیں

رسمِ دوستی اکثر لوگ یوں نبھاتے ہیں
دل سے دل نہیں ملتا ہاتھ تو ملاتے ہیں

دل جہاں پہ لوگوں کے خود ہی ڈوب جاتے ہیں
ہم تو ایسی منزل پر راستہ دکھاتے ہیں

وہ چمن پرستوں میں کیسے ہو گئے شامل
جو بھری بہاروں میں آشیاں جلاتے ہیں

کیوں مذاق اڑاتی ہے اے بہار تو اپنا
دیکھ پھول ہنستے ہیں غنچے مسکراتے ہیں

راستے وفاؤں کے ہم سے ہو گئے روشن
ہم چراغِ نقشِ پا ہر جگہ جلاتے ہیں

شہر کی فضاؤں میں اک نکھار آتا ہے
خونِ دل ضمیر اپنا جب بھی ہم بہاتے ہیں

حسن کی رنگینیوں کا بانکپن اچھا لگا
گلبدن غنچہ دہن رشکِ چمن اچھا لگا

حسن کے معنوں میں لفظوں کا یہ فن اچھا لگا
اے غزل مجھ کو ترا یہ بانکپن اچھا لگا

سب میں رہ کر بھی نظر آنے لگا سب سے الگ
اس لئے مجھ کو چراغِ انجمن اچھا لگا

خار کی توہین ہے نہ پھول کی تحسین ہے
زندگی ترے چمن کا یہ چلن اچھا لگا

گھر جلا کے میرا گھر گھر میں چراغاں کر دیا
یہ طریقہ آپ کا اے ہم وطن اچھا لگا

ہنستے ہنستے رو پڑا اور روتے روتے ہنس پڑا
عشق میں تیرا مجھے دیوانہ پن اچھا لگا

رفتہ رفتہ ان کے دل پر بھی اثر ہوتا گیا
اے ضمیر اپنا یہ اندازِ سخن اچھا لگا

آپ کا انتظار ہے اب تک
دل بہت بے قرار ہے اب تک

وعدہ کر کے بھی وہ نہیں آئے
وعدہ کا اعتبار ہے اب تک

پھر نہ آیا ہمارے بعد کوئی
کیا وہی رہگزار ہے اب تک

آشیاں جل کے مدتیں گذریں
برق کیوں شعلہ بار ہے اب تک

فصلِ گل آئی ہے گلستاں میں
کیوں فضا سوگوار ہے اب تک

جانے والے چلے گئے لیکن
خالی دل کا دیار ہے اب تک

جس نے ہم کو بھلا دیا دل سے
اے ضمیرؔ اس سے پیار ہے اب تک

اشعار اگر ہم کسی محفل میں سنا دیں
حالات کے آئینوں کو ہاتھوں میں تھما دیں

لفظوں کی دکانوں میں تجھے کچھ نہ ملے گا
مل ان سے حقیقت میں خدا سے جو ملا دیں

جو عشق کی منزل ہے وہ ملتی نہیں سب کو
یہ شرط ہے آپ اپنے کو دیوانہ بنا دیں

اک خاک نشیں بندۂ ناچیز ہیں لیکن
ہم چاہیں تو سر قدموں پہ شاہی کا جھکا دیں

اوروں کے سدا عیب و ہنر ڈھونڈنے والے
خود راہِ عمل پر کبھی چل کر تو بتا دیں

سہمے ہوئے حالات کے ماروں سے یہ کہہ دو
طوفانوں میں ایماں کی ذرا شمع جلا دیں

زندہ ہے ضمیر اپنا تو آواز سے اس کی
سوئے ہوئے انسانوں کو غفلت سے جگا دیں

میں نے تو ہر اک غم میں ترا نام لیا ہے
یہ تیرا کرم ہے جو مجھے تھام لیا ہے

پیتا ہوں تری مست نگاہی سے اے ساقی
ساغر نہ صراحی نہ کوئی جام لیا ہے

افسانۂ ہستی کے لیے اے غمِ دوراں
آغاز لیا ہم نے نہ انجام لیا ہے

یہ درد یہ آنسو یہ تڑپتی ہوئیں آہیں
یہ بارگہِ عشق سے انعام لیا ہے

پیمانے خود اطراف مرے گھوم رہے ہیں
میخانے میں ساقی نے مرا نام لیا ہے

پیتے ہی جب کھلتے ہیں اسرار دو عالم
ساقی کی نگاہوں سے وہی جام لیا ہے

اس وقت ضمیرؔ اپنے لبوں پر تھا تبسم
جب زندگانی نے موت کا پیغام لیا ہے

ہم تو ہر بات کو بے خوف و خطر کہتے ہیں
لوگ حق کو بھی یہ الفاظِ دِگر کہتے ہیں

گیسو و رخ کو ترے شام و سحر کہتے ہیں
ہم تری دید کو معراجِ نظر کہتے ہیں

موت منزل نہیں اک مرحلہ ہے رستے کا
اس کو دنیا سے گذرنے کا سفر کہتے ہیں

غم پہ اوروں کے چھلکتے ہوئے اشکوں کی قسم
کہنے والے تو انہیں لعل و گہر کہتے ہیں

ناز کس منہ سے کرے اپنے ہنر پر کوئی
آج تو عیب کو بھی لوگ ہنر کہتے ہیں

ڈوب جاتے ہیں خموشی سے محبت والے
اس لئے ہم تری آنکھوں کو بھنور کہتے ہیں

نہ وفا ہے نہ محبت نہ مروّت نہ خلوص
جو بشر ایسا ہو گیا اس کو بشر کہتے ہیں

اے ضمیر اس لئے ایمان ہے منزل تیری
حق پرستی کا اسے لوگ اثر کہتے ہیں

تو عبث اس کی جستجو میں ہے
وہ نہاں شہ رگِ گلو میں ہے

حسرتوں میں نہ آرزو میں ہے
لطف ملنے کا دو بہ دو میں ہے

نفس کو مار زندگی کے لئے
تیرا دشمن تیرے لہو میں ہے

کیوں میں منزل کو ڈھونڈنے جاؤں
وہ تو خود میری جستجو میں ہے

حسن والوں میں بے وفائی ہے
اور وفا عاشقوں کے خو میں ہے

جانِ گلشن ہے تیری رعنائی
تو ہر اک گل میں رنگ و بو میں ہے

پی رہا ہوں میں آنکھوں سے
وہ کہاں جام میں سبو میں ہے

زندگی کا پیام دیتی ہے
وہ روانی جو آبِ جو میں ہے

تجھ کو دیوانگی نے پہچانا
عقل حیرانِ جستجو میں ہے

موت کا نام ہے سکوتِ حیات
زندگی شورِ ہا و ہو میں ہے

ساری دنیا ضمیر اب تک بھی
امتیازاتِ ما و تو میں ہے

عکس و ذات کی حد میں آنکھ محوِ حیرت ہے

جو تمہاری صورت ہے وہ ہماری صورت ہے

قربتوں میں دوری ہے دوریوں میں قربت ہے

اپنی اپنی قسمت ہے اپنی اپنی نسبت ہے

خونِ دل سے لکھی ہے ہم نے یہ غزل صاحب

تم قبول کر لینا تحفہ پیشِ خدمت ہے

اس کا فیض جاری ہے آ اے مانگنے والے

بھر لے دامنِ مقصد تیری جتنی ہمت ہے

ترا فیض کیا کم ہے اور تجھ سے کیا مانگوں

جو ضمیر زندہ ہے یہ تیری عنایت ہے

دل میں رکھنے کے ہیں زخمِ دل دکھانے کے نہیں
جو سرِ مژگاں چمکتے ہیں یہ وہ تارے نہیں

جو قدم رکھتے ہیں منزل
زندگی کے راستوں پر

ان سے کیا ہوگی توقع عظمتِ کردار کی
جو کسی بے کس کو سینے سے لگا سکتے نہیں

انقلابوں نے کہاں پہو
غیر بھی کل اپنے بھے آ

کیوں نویدِ فصلِ گل دیتی ہے ہم کو زندگی
زخمِ دل وہ پھول ہیں جو کھل کے ہنس سکتے نہیں

جان و دل قربان کر کے
سوچتا ہوں میں یہ سو

رہبری کا ان کو دعویٰ حیف ہے صد حیف ہے
دو قدم بھی اپنے قدموں پر جو چل سکتے نہیں

ان سے خوشبو کی تمنّا ہے
ذہن و دل جن کے حجبت

○

کل جو خوشبو کی طرح پھرتے تھے گلزاروں میں
آج وہ قید ہیں خود گھر کی ہی دیواروں میں

نہ ملے گا کوئی اشکوں کے خریداروں میں
لے کے جاؤ نہ یہ موتی کبھی بازاروں میں

ہم گنہگاروں پہ ہر وقت کرم ہے ان کا
نام لکھا نہ کبھی اپنا گنہگاروں میں

نہ ملے جام تو پی لیتے ہیں آنسو اپنے
ایسے بھی لوگ ہیں ساقی تیرے میخواروں میں

وہ ہزاروں میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں
نام جن کا نہیں چھپتا کبھی اخباروں میں

بن کے ہم شمع سر راہ جلا کرتے ہیں
ہم نہیں جاتے کبھی شاہوں کے درباروں میں

جن کے ہاتھوں میں قلم کچھ بھی نہیں لکھ سکتا
نام لکھا ہے کوئی ان کا قلم کاروں میں

زندگی کی تجھے تصویر نظر آئے گی
جا کبھی درد کے مارے ہوئے بے چاروں میں

جس کو کہتے ہیں ضمیرؔ اس کی ہے منزل حق پر
وہ کہاں ملتا ہے بازاروں میں درباروں میں

کب مٹے گا دردِ پیہم کچھ نہ سوچ
ہے عطائے عشق یہ غم کچھ نہ سوچ

ان کی نظریں ہم سے ہیں بدلی ہوئیں
ہے مزاجِ یار برہم کچھ نہ سوچ

بیٹھے بیٹھے یاد کوئی آ گیا
ہو گئی کیوں آنکھ پرنم کچھ نہ سوچ

لذتِ زخمِ جگر محسوس کر
ہو نہیں سکتا کبھی کم کچھ نہ سوچ

فیض کس کے در کا ہے یہ جان لے
ہو گئیں ہیں گردنیں خم کچھ نہ سوچ

دیکھ عالم کی حقیقت کو ضمیرؔ
اپنا یہ کیسا ہے عالم کچھ نہ سوچ

حسین رُخ ہے تمہارا کسی چمن کی طرح
ملا نہ کوئی بھی مجھ کو یہ بانکپن کی طرح

مزہ تو جب ہے سنے خود وہ داستاں مجھ سے
کوئی سخن کہاں لائے مرے سخن کی طرح

ہنسو کہ ہوگا اجالا ہماری محفل میں
تمہاری موجِ تبسّم ہے اک کرن کی طرح

ملو تو مجھ سے سنبھل کر ذرا ملو صاحب
وجود رکھتا ہوں میں ایک انجمن کی طرح

ہر ایک آنے کو آتا ہے یوں تو محفل میں
ضمیرؔ آپ تو آئے ہیں اہلِ فن کی طرح

تو نے دل میں جو کبھی اس کو اتارا ہوتا
تجھ کو قطرے میں سمندر کا نظارا ہوتا

آپ کی چشمِ کرم کا جو اشارا ہوتا
عمر بھر کے لئے جینے کا سہارا ہوتا

کچھ تصدق ترے در کا کچھ اتارا ہوتا
بس یوں ہی اپنا زمانے میں گذارا ہوتا

ترے دامن کا اگر ہم کو سہارا ہوتا
دوست تو دوست ہے دشمن بھی ہمارا ہوتا

خود ہی طوفان ترے حق میں کنارا ہوتا
ڈوبنے والے اگر اس کو پکارا ہوتا

اس کو آنکھوں سے اگر دل میں اتارا ہوتا
ہر پردے کا پردہ نظارے کا نظارا ہوتا

موت آئی بھی تو مرتا نہیں جینے والا
اے ضمیرؔ اتنا اگر حق کا اشارا ہوتا

دید سب کچھ ہے اک آدمی کے لئے
ورنہ کیا ہے یہاں زندگی کے لئے

عظمتِ زیست ہے بس اسی کے لئے
زندگی جس کی ہو بندگی کے لئے

لوگ جیتے رہے دشمنی کے لئے
ہم تو مرتے رہے دوستی کے لئے

نقشِ پا چھوڑ کر روشنی کے لئے
آپ گذرے مری رہبری کے لئے

نہ آیا یقیں آپ کو عمر بھر
ہم تو جیتے ہیں اک آپ ہی کے لئے

پھول گلشن میں کھل کر جھڑ جا گئے
درس عبرت بنے ہر کلی کے لئے

آؤ ہم سے ملو آؤ ہم سے ملو
روشنی کے لئے روشنی کے لئے

حوصلہ چاہیئے ان کے دیدار کو
ان کا جلوہ نہیں ہر کسی کے لئے

یاد ہیں جن کی ہم جان سے بھی گئے
وہ نہ آئے گھڑی دو گھڑی کے لئے

خونِ دل دے کے روشن کئے ہیں چراغ
زندگی وقف کی شاعری کے لئے

خود تصور سے روشن ہے اپنا ضمیر
ہم ترستے نہیں روشنی کے لئے

میں ہوں بیمار دوا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی
اپنے آنچل کی ہوا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

وہی آواز وہی ساز وہی محفل ہے
پھر وہی گیت سنا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

امتحان میری وفاؤں کا اگر ہے منظور
دار پر مجھ کو چڑھا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

موجیں طوفاں کی اے دوست ڈبو دیں نہ مجھے
تم مجھے پار لگا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

اب تم آئے ہو جفاؤں پہ پشیماں ہو کر
مجھ کو احساس دلا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

جب ضمیر اپنا سلامت ہے تو پروا کیا ہے
تم زمانے کو بتا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

جہاں میں جس کو بھی خالق بڑائی دیتا ہے
اسے جہاں کے غموں سے رہائی دیتا ہے

ہر ایک سمت مسلط گھنا اندھیرا تھا
مگر وہ دور سے مجھے سجھائی دیتا ہے

خدا کے نام سے ہر کام اپنا کر ناداں
تو نارسا ہے تو تجھ کو رسائی دیتا ہے

وہ شانِ دیدہ وری بخش دی محبت نے
ہے جلوے پردے میں لیکن دکھائی دیتا ہے

ضمیر سے کوئی بہتر نہیں ہے دوست اپنا
مٹا کے دل سے برائی بھلائی دیتا ہے

اگر ہے جذبۂ صادق تو عشق کامل ہے
نہیں تو عشق کا دعویٰ جو ہے وہ باطل ہے

نہ وہ زمانہ نہ ہم ہیں نہ اب وہ محفل ہے
مگر یہ دل ہے کہ اب تک اسی پہ مائل ہے

نہ راہ رو ہے نہ جادہ نہ کوئی منزل ہے
فقط خیالِ سفر زندگی کا حاصل ہے

ہر اک ادا ہے بلا ہر نگاہ قاتل ہے
ہمارا دل ہی تو ہے جو ترے مقابل ہے

حیات و موت کے جو درمیان حائل ہے
وہ ایک لمحہ ہی تسکینِ دیدہ و دل ہے

ہزار اٹھیں بھی طوفاں تو غم نہیں مجھ کو
کرم اک آپ کا ہر حال میں جو شامل ہے

وہ آنکھ آنکھ نہیں ہے وہ قلب قلب نہیں
ترے خیال تری دید سے جو غافل ہے

اے جانے والے تجھے یہ خبر نہیں شاید
ترے بغیر میں زندہ رہوں یہ مشکل ہے

ضمیرؔ لوگ ہزاروں ملیں گے ملنے کو
حقیقتاً ہو کوئی دوست سخت مشکل ہے

خاموشیوں میں میری عجب بول چال ہے
تو ہی جواب ہے مرا تو ہی سوال ہے

لکھا ہوا ہر ایک کے چہرے پہ حال ہے
یہ وہ کتاب ہے جسے پڑھنا کمال ہے

اے دل تو ہی بتا دے گذرتی ہے کس طرح
وہ پوچھتے ہیں مجھ سے مرا کیا حال ہے

اب میری زندگی میں اندھیرا نہ آئے گا
روشن کسی سے محفلِ فکر و خیال ہے

کیا چال چل سکے گا زمانہ ہمارے ساتھ
ہم جانتے ہیں کیسی زمانے کی چال ہے

اسباب سے اُمید مسبب سے نا امید
اے بندۂ خدا تجھے کچھ بھی خیال ہے

خبر بھی ہے تجھے یہ زندگی سمندر ہے
تو موجِ غم سے نکل آ اگر شناور ہے

تمہارا حسنِ مجسم بہار ہے گویا
تمہارے سامنے شرمندہ ہر گلِ تر ہے

کبھی تو آؤ ذرا تم غریب خانے پر
تمہاری راہِ گذر میں غریب کا گھر ہے

خیال و فکر کی شیشہ گری سے کیا حاصل
یقیں دل میں نہیں تو دل بھی پتھر ہے

نہ جانے میری غزل بے ہنر کی محفل میں
ہر ایک لفظ مرا مثلِ لعل و گوہر ہے

جگر کا خون دیا جس نے شاعری کو ضیاؔ
اسی کے دم سے یہاں عظمتِ سخنور ہے

جلوہ پردہ ہو گیا یا پردہ جلوہ ہو گیا
دیدۂ بینا کا محفل میں تماشا ہو گیا

تیرے فیضانِ بصیرت کا کرشمہ ہو گیا
اک ترا بیمار دنیا کا مسیحا ہو گیا

فیضِ نسبت کیا کہوں ادنیٰ بھی اعلیٰ ہو گیا
جس طرح دریا میں مل کے قطرہ دریا ہو گیا

میں ترے در کے تصدق میں ترے در کے نثار
میرے جینے اور مرنے کا سہارا ہو گیا

اللہ اللہ عشق کے گلشن کا کیا دستور ہے
آگ سے تازہ ہوا پانی سے سوکھا ہو گیا

نقشِ پائے یار ہیں میرے تصور میں ضمیرؔ
اب مجھے کیا خوف ہے آسان رستہ ہو گیا

آنے لگی ہے آنچ بہت گلستان پر
الزام آ نہ جائے کہیں باغبان پر

تم وہ ہو بیچ آئے ہو غیرت دکان پر
ہم وہ کہ مر گئے ہیں جو خود اپنی آن پر

کیا زندگی مری ثمر آور درخت ہے
پتھر برس رہے ہیں جو میرے مکان پر

اہلِ وفا بھلا نہیں سکتے مجھے کبھی
آؤں گا یاد عشق کے ہر امتحان پر

الفقر و فقری جن کا ہو مقصودِ زندگی
رکھتے نہیں نظر کبھی سونے کی کان پر

ہم کو خدائے پاک نے بخشا ہے وہ شرف
حق ہے ہمارا اس لئے دونوں جہان پر

اہلِ ہنر سے کہہ دو کریں تبصرہ ضمیر
پابندیاں لگا کے زبان و بیان پر

عزم و ہمت ہیں تو مشکل کے حوالے کر دو
نقشِ پا رہرہ منزل کے حوالے کر دو

ظلم کے آگے جھکاؤ نہ کبھی سر اپنا
عظمتِ زیست نہ قاتل کے حوالے کر دو

خود ہی کھل جائیں گے اسرارِ محبت تم پر
عقل کو پہلے ذرا دل کے حوالے کر دو

جہدِ پیہم سے ہوا کرتی ہے مشکل آساں
زندگی کو ذرا مشکل کے حوالے کر دو

زندگی کی اسے تصویر یہاں دکھلا دوں
لاؤ اس کو مری محفل کے حوالے کر دو

مصلحت کوش ہیں سوداگرِ دین و ایماں
بھول کر حق کو نہ باطل کے حوالے کر دو

خود ہی سن لیجئے صدائیں وہ ضمیرِ حق کی
تم نہ ان کو کبھی باطل کے حوالے کر دو

ان کو دعویٰ ہے بہت حق کی پرستاری کا
امتحاں دے نہیں سکتے جو وفاداری کا

تیرے دیوانے سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں
یہی دیوانہ سبق دیتا ہے ہشیاری کا

مجھ کو لے جاؤ نہ زرداروں کی محفل میں کبھی
چھوٹ سکتا نہیں دامن مری خودداری کا

آج پھرتے ہیں وہی شہر کے بازاروں میں
جن کے رخ پر کبھی پردہ تھا حیاداری کا

انقلابات کی کچھ تم کو خبر ہے کہ نہیں
خوابِ غفلت سے اٹھو وقت ہے بیداری کا

خونِ دل خونِ جگر خونِ وفا سے لکھو
شاعری نام ہے جذبات کی گلکاری کا

عظمتِ فکر و نظر تیرا خدا حافظ ہے
شاعری بن گئی اک مشغلہ بےکاری کا

ذہن و دل ہو گئے مفلوج خدا خیر کرے
اب مسیحا ہے کہاں روح کی بیماری کا

ہم کہاں جائیں گے اب سادہ مزاجی لے کر
آج کے دور میں فن عام ہے مکاری کا

ہے فقط آپ کے دامن کا سہارا مجھ کو
ورنہ دفتر ہے سرِ حشر سیہ کاری کا

اے ضمیر اپنی حقیقت کا اجالا دے دے
سایہ ہر سو نظر آتا ہے گنہ گاری کا

یا الٰہی خیر ہو کیا دور ہے آیا ہوا
جو ملا مجھ سے رہ اپنے پر ہے اترایا ہوا

برق کا دامن ہے ہر سو آج لہرایا ہوا
کس کے دل میں آشیاں کا ہے خیال آیا ہوا

اک اشارے پر تیرے سب کچھ لٹا سکتا ہوں میں
بن کے دیوانہ تری محفل میں ہوں آیا ہوا

انجمن در انجمن روشن کئے میں نے چراغ
میرے گھر میں تو اندھرا ہے مگر چھایا ہوا

میں نے سینے سے لگایا اس کو بھی اے دوستو
جو زمانے میں زمانے کا ہے ٹھکرایا ہوا

ہے کرم ساقی ترا ہر بزم میں ہر حال میں
تو ہے میرے سامنے ساغر بدست آیا ہوا

میرے خونِ دل کو پی کر لفظ موتی بن گئے
اب غزل کے رخ پہ ہے رنگیں نکھار آیا ہوا

قتل کا الزام کیسے دوں یہ بتلائے کوئی
میرا دشمن میرا قاتل میرا ہم سایا ہوا

حیدرآبادِ دکن میں اب بھی اُردو کی قسم
پرچمِ شعر و سخن ہر سو ہے لہرایا ہوا

جس کو جینے کا سلیقہ تک نہیں ہے اے ضمیر
ہاتھ میں اس کے چھلکتا جام ہے آیا ہوا

کوئی چمن میں ہے نہ کوئی انجمن میں ہے
دیوانہ تیرا منزلِ دار و رسن میں ہے

ایسی بہارِ حسن مرے گلبدن میں ہے
برق و شررر کا رقص نہاں پیرہن میں ہے

اردو کی سرخ روئی جو ملک دکن میں ہے
خونِ جگر کا رنگ ہمارے سخن میں ہے

جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں کائنات میں
لطفِ بہار تجھ سے چمن در چمن میں ہے

دیکھا تھا بجلیوں کو کبھی ان کی آنکھ میں
اک آگ سی لگی ہوئی اب تک بدن میں ہے

اٹھو اے غافلو یہ تقاضا ہے وقت کا
درسِ حیات صبح کی پہلی کرن میں ہے

رویا ہوں اس قدر کہ ہنسی لب پہ آگئی
آرام اس لئے مجھے دیوانے پن میں ہے

ہم مر گئے تو مردہ سمجھتے ہیں بے خبر
آغازِ نو حیات کا گویا کفن میں ہے

تیری صدا صدائے حقیقت ہے اے ضمیر
آوازِ حق کی تیری زبان و دہن میں ہے

میں تو ڈوبا تھا مگر تم نے ابھارا ہے مجھے
جانتا ہوں یہ کرم صرف تمہارا ہے مجھے

میرے دل میں ہیں نہاں کون و مکاں کے جلوے
تو نے دی ذوقِ نظر دعوتِ نظارہ مجھے

فکر جینے کی ہے مجھ کو نہ تو غم مرنے کا
دو جہاں کے لئے اک تیرا سہارا ہے مجھے

تو نے کچھ ایسی محبّت کی نظر بخشی ہے
میں جدھر دیکھوں ادھر تیرا نظارا ہے مجھے

یہ عجب ربطِ محبّت ہے کوئی کیا جانے
میں نے دل کو تو کبھی دل نے پکارا ہے مجھے

میرے صہبائے محبّت میں ترا عکس حسیں
گاہ شبنم ہے مجھے گاہ شرارا ہے مجھے

میں سمجھتا ہوں یہ خاموش نگاہوں کی زباں
اے ضمیرؔ اجنبی نظروں نے پکارا ہے مجھے

نگاہِ وقت اگر بدلی کسی سے
نظر آتے ہیں اپنے اجنبی سے

میں واقف ہوں رموزِ بے خودی سے
مجھے کیا واسطہ ہے میکشی سے

بھروسہ زندگی پہ کرنے والے
تو واقف ہی نہیں ہے زندگی سے

وہ تجھ میں اور تو اس میں ہے لیکن
پتہ مل جائے گا تجھ کو تجھی سے

تو اپنا خونِ دل دے دے چمن کو
بہار آجائے گی اے دل ابھی سے

غزل تو خون مانگے ہے جگر کا
تو فن کو دور رکھنا شاعری سے

ہے لاکھوں میں بھی کوئی ایک ایسا
ملا دے آدمی کو آدمی سے

ہجومِ آہ سے ٹوٹے نہ اک دن
بندھا تارِ نفس ہے زندگی سے

تو میرے شعر ہی میں دیکھ مجھ کو
ملا ہے آئینہ یہ شاعری سے

ضمیرؔ ان بے ضمیروں سے تو کہہ دے
جو ہیں محرومِ حق کی روشنی سے

ہر شئے تمہاری بولتی تصویر بن گئی ہے
میری نظر کی اس طرح تقدیر بن گئی ہے

خاموش آرزوؤں کی تفسیر بن گئی ہے
میری غزل اب آپ کی تصویر بن گئی ہے

خونِ جگر میں ڈوب کے ابھری ہے شاعری
تاریکیوں میں فکر کی تنویر بن گئی ہے

نابینا کو بھی دیدۂ بینا عطا ہوا
خود خاکِ پا بھی آپ کی اکسیر بن گئی ہے

بڑھنے کا فن ہے تجھ میں تو چہرے کو پڑھ ضمیر
آوازِ دل کی چہرے کی تحریر بن گئی ہے

کہیں زلف کھول کر وہ لبِ بام آ نہ جائے
مجھے خوف ہے مرا دل تہہ دام آ نہ جائے

جسے زندگی سمجھ کر میں نے عمر بھر پکارا
مرے لب پہ آہ بن کر وہی نام آ نہ جائے

کبھی جذبۂ محبت تو زباں نہ کھول اپنی
وہ اٹھا کے رخ سے پردہ سرِ عام آ نہ جائے

ہو جہاں پہ سر بہ سجدہ یہ وقارِ آدمیت
مری راہِ زندگی میں وہ مقام آ نہ جائے

مجھے آج زلفِ برہم تری یاد آ رہی ہے
مری زندگی کی آخر کہیں شام آ نہ جائے

کبھی آس ڈوبتی ہے کبھی نبض ڈوبتی ہے
کہیں اے اجل زباں پر ترا نام آ نہ جائے

سرِ حشر دیکھتا ہے مجھے بار بار کوئی
اسے خوف ہے کہ اس کا کہیں نام آ نہ جائے

میں نظر سے پی رہا ہوں یہی میکشی کی حد ہے
مری سمت دیکھ ساقی کوئی جام آ نہ جائے

میں فسانۂ غمِ دل تجھے کس طرح سناؤں
کہیں لب پہ آنسوؤں کے ترا نام آ نہ جائے

اے ضمیر وقتِ مشکل تو پکار اپنے رب کو
میں سزا قبول کر لوں جو یہ کام آ نہ جائے

پیش نگاہ عارض و گیسو رہیں مدام
اپنی یہ صبح صبح ہے اپنی یہ شام شام

تیرا کرم کہ تو نے نوازا ہے وہ مقام
منزل دکھائی دینے لگی مجھ کو زیر گام

ساقی بگڑ کے رہ گیا میخانے کا نظام
پیاسے ہیں خود ہی مینا سبو خم صراحی جام

تم کو بھلا سکوں یہ تو ممکن نہیں رہا
تم ہم خیال و ہم زباں ہم راز و ہم خیال

کھونے کی کچھ خبر ہے نہ پانے کی کچھ خبر
یہ سوچتا ہی رہ گیا میں زندگی تمام

پہچانتے ہیں صاحب علم و ادب مجھے
مجھ کو یہ غم نہیں ہے کہ واقف نہیں عوام

خون جگر ہے میرا ہر اک پھول کے لئے
کس کا چمن ہے سوچنا میرا نہیں ہے کام

اے جینے والو تم سے یہ کہتی ہے ہر گھڑی
کر لو بھلائی کچھ یہاں دو روزہ ہے قیام

محفل میں بیٹھتے ہیں جگہ خاص دیکھ کر
پہلے کسی کے دل میں تو پیدا کریں مقام

ہم کو مٹا سکا نہ زمانہ کبھی ضمیرؔ
زندہ رہے گا ہم سے وفا کا ہمیشہ نام

گھبرا کے عبث روتے ہیں ہم موت کے ڈر سے
حالانکہ ہیں واقف بہت انجامِ سفر سے

گذرا ہوں میں اس طرح تری راہگذر سے
اپنوں نے بھی دیکھا مجھے غیروں کی نظر سے

دیکھو تو بہت دور رہوں میں اپنے ہی گھر سے
سمجھو تو صدا آتی ہے دیوار سے در سے

مانا کہ یہ اپنوں کی ہی بستی ہے مگر دوست
پتھر مری سمت آتے ہیں ہر بار کدھر سے

اے گردشِ دوراں نہ دکھا مجھ کو تو آنکھیں
گذرے ہیں ستم کے کئی بادل مرے سر سے

دیتے ہوئے تسکیں بھی تسلّی بھی دعا بھی
وہ دوست کہ انداز سے نکلے مرے گھر سے

مہکی ہوئی زلفوں سے معطر ہیں فضائیں
محسوس یہ ہوتا ہے وہ گذرے ہیں ادھر سے

دنیا مرے دل کی ہے ضیاء بار ابھی تک
اک بار وہ اترے تھے مرے دل میں نظر سے

دنیا نے ضمیرؔ اس کو کہا سرخ سویرا
ٹپکا ہے لہو جب بھی مرے دیدۂ تر سے

تو ساتھ جب بھی رہا تیرگی نہیں آئی
ترے بغیر کبھی روشنی نہیں آئی

حقیقتوں کے سوا کچھ نہیں ہے شعروں میں
مبالغہ کا مجھے شاعری نہیں آئی

یہ کہکشاں یہ شفق اور یہ چاند تاروں میں
تمہارے حسن کی سی دلکشی نہیں آئی

ہر اک گام مرا آشنائے منزل ہے
مرے قریب کبھی گمرہی نہیں آئی

کیا تھا جشنِ چراغاں کا اہتمام بہت
ترے بغیر کبھی روشنی نہیں آئی

تو دیکھ چشمِ بصیرت سے دل کا آئینہ
چراغِ طور میں یہ روشنی نہیں آئی

بہارِ گل کا لہو ہے رگوں میں کانٹوں کی
یہ کیا کہ کانٹوں کو اب تک ہنسی نہیں آئی

کسی کے نام سے قائم اگر حیات نہیں
سمجھ لو خود تمہیں وابستگی نہیں آئی

تلاشِ منزلِ حق میں بھٹکتے پھرتے ہیں
قریب جن کے کبھی حق رسی نہیں آئی

مرے خدا تو بتا دے یہ امتحاں کب تک
گرے گی میرے نشیمن پہ بجلیاں کب تک

نہ کوئی طرز نیا ہے نہ کوئی بات نئی
سناؤ گے وہی فرسودہ داستاں کب تک

یہی سمجھ کے مجھے امتحان دینا ہے
رہے گا مجھ سے زمانہ یہ بدگماں کب تک

نہ کوئی راہ نما ہے نہ کوئی منزل ہے
بھٹکتا یونہی رہے گا یہ کارواں کب تک

ہماری کشتیٔ امید ہے تھپیڑوں میں
یہ دیکھنا ہے رہے گی رواں دواں کب تک

ضمیرؔ ہم کو وفا کا صلہ نہیں ملتا
ہمارا خونِ وفا جائے رائیگاں کب تک

وہ عظمتِ انساں کبھی پایا نہیں کرتے
غیروں کو محبت سے جو اپنا نہیں کرتے

بیمارِ محبت کا مداوا نہیں کرتے
تم کیسے مسیحا ہو کہ اچھا نہیں کرتے

دنیا میں ہیں پر خواہشِ دنیا نہیں کرتے
جس بات میں دھوکا ہے وہ سودا نہیں کرتے

ہے ناز بہت ان کو عبث اپنے ہنر پر
فنکار تو فن کا کبھی دعویٰ نہیں کرتے

کیا ان سے توقع ہو بھلا دادِ سخن کی
جو شعر کے مفہوم کو سمجھا نہیں کرتے

حق اپنے پڑوسی کا ادا خاک کریں گے
جو اپنے ہی گھر کو کبھی دیکھا نہیں کرتے

وہ حقِ عبادت کو ادا کیسے کریں گے
بھولے سے بھی جو شکر کا سجدہ نہیں کرتے

بنیاد کے پتھر کی طرح رہیئے ضمیرؔ آپ
یوں اپنی بڑائی کا تماشا نہیں کرتے۔

جب بھی خیال آیا ہے گیسوئے یار کا
منظر نظر میں پھر گیا ابرِ بہار کا

روتے ہیں پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
آتا ہے جب خیال تری رہگذار کا

اُمید کی کرن نظر آئی تو کیا کروں
جب پی لیا ہے زہر شبِ انتظار کا

ہر داغِ دل کو رشکِ گلستاں بنا کے بھی
کیوں رو رہا ہے تھام کے دامن بہار کا

پیتا ہے گھول کر غمِ دوراں کی تلخیاں
ساقی یہ حوصلہ ہے ترے بادہ خوار کا

بنیادِ آشیاں کی الٰہی کہاں رکھوں
ہر سمت دور دورہ ہے برق و شرار کا

اس کو جہاں میں اہلِ جہاں پوچھتے ہیں کب
کیا حال پوچھتے ہو غریب الدیار کا

ناحق پرست کیلئے پھولوں کا فرش ہے
اور حق پرست کے لئے تختہ ہے دار کا

خطرہ جہاں کہیں ہو وہیں آشیاں رہے
یہ حکم ہے ضمیرؔ دلِ وضعدار کا

ہر ہر نفس کو بر سرِ پیکار دیکھئے
ہر زندگی پہ موت کے آثار دیکھئے

ہر ایک سانس بن گئی تلوار دیکھئے
یہ عالمِ مفارقتِ یار دیکھئے

یہ انقلابِ وقت کی رفتار دیکھئے
ویران کتنے ہو گئے گلزار دیکھئے

کب سے ہوں منتظر نگہِ التفات کا
اک بار تو ادھر مرے سرکار دیکھئے

شاید اسیرِ نرغۂ شب ہے سحر ابھی
سر کتنے چل رہے ہیں سیہ دار دیکھئے

پھر لذّتِ جفا کو ترستی ہے زندگی
دل پھر ہوا ہے غم کا طلبگار دیکھئے

شرطِ سفر کے ساتھ جو عزمِ سفر بھی ہو
کس طرح راہ ہوتی ہے ہموار دیکھئے

ہم تو وفا کے نام پہ قربان ہو گئے
اہلِ جہاں یہ عشق کا معیار دیکھئے

کیفِ حیات و دردِ محبت کے ساتھ ساتھ
خواجہ ضمیرؔ کے ذرا اشعار دیکھئے

وہ کبھی روشنی سے مل نہ سکے
جو غمِ تیرگی سے مل نہ سکے

آپ کے در سے اُٹھ کے دیوانے
پھر کبھی زندگی سے مل نہ سکے

جس کی ہر سانس میں پرستش کی
ہم اسی اجنبی سے مل نہ سکے

پاسِ انسانیت رہا ہر دم
یہ بھلی یہ بُری سے مل نہ سکے

ان کا جینا بھی کوئی جینا ہے
جو کبھی آپ ہی سے مل نہ سکے

ضبطِ غم سے رہیں ملاقاتیں
ہم غمِ برہمی سے مل نہ سکے

شکوہ غیروں سے کیا کریں گے ضمیرؔ
دوست بھی دوستی سے مل نہ سکے

تیرا دیوانہ ترے عشق میں کیا ہو بیٹھا
تیرا دل تیری نظر تیری ادا ہو بیٹھا

تو اگر ساتھ مرے ہے تو مجھے کیا پروا
غم نہیں مجھکو زمانہ جو خفا ہو بیٹھا

وقت کا ہے یہ تقاضا یا سمجھ کا دھوکا
کل جو اچھا تھا وہی آج برا ہو بیٹھا

آپ آئینگے یا آئے گی اجل کیا معلوم
آج تو دردِ جگر حد سے سوا ہو بیٹھا

ہم کو تجھ سے تو شکایت ہی نہیں ہے کوئی
یہ الگ بات ہے تو ہم سے خفا ہو بیٹھا

کتنا انمول ہے جو درد دیا ہے تو نے
عمر بھر کی یہ وفاؤں کا صلہ ہو بیٹھا

سنگدل بن گیا ہے دیکھیے پتھر کا صنم
میں نے چاہا تھا جسے اب وہ خدا ہو بیٹھا

ڈھونڈنے والوں کو کچھ اسکی خبر ہے کہ نہیں
میں کہیں بھی رہوں وہ میرا پتہ ہو بیٹھا

ایک ایسا بھی مقام آیا ہے الفت میں ضمیر
دل کا ساتھی ہی مرا خود دل سے جدا ہو بیٹھا

اک بار ہی سہی ذرا دیجئے صدا مجھے
منزل دکھائی دیگی ابھی زیرِ پا مجھے

بخشا ترے کرم نے عجب حوصلہ مجھے
یہ دشت کیا ہے دریا نے رستہ دیا مجھے

طوفاں کا خوف اس کو ہے مجھکو خدا کا خوف
پہچانتا نہیں ہے ابھی ناخدا مجھے

دونوں جہاں کی آس ہے اک آپکی نظر
وابستہ اپنے آپ سے رکھنا سدا مجھے

خونِ جگر سے میں نے تو روشن کئے چراغ
اے کاش کوئی بزم میں پہچانتا مجھے

دستک بغیر گھر جو مقفل تھا کھل گیا
اک بار اپنے آپ سے ملنا پڑا مجھے

آئینہ گر کو دیکھتا ہوں آئینے میں میں
ایسا ہوا ہے دیدۂ بینا عطا مجھے

روشن ہوئے چراغ امیدوں کے ہر طرف
تیرا خیال جب بھی ذرا آگیا مجھے

آغاز ہی میں دیکھا ہے انجام دوستو
ہر ابتداء پہ ملتی رہی انتہاء مجھے

ہر ذرہ میرے حق میں بنا رازِ معرفت
شکرِ خدا وہ فیضِ بصیرت ملا مجھے

کیا کیا گنہ نہ مجھ سے ہوئے ہیں حیات میں
لیکن ترے کرم نے کیا کیا سے کیا مجھے

کس کو سناؤں حالِ غمِ زندگی ضمیر
ملتا نہیں ہے ایک بھی درد آشنا مجھے

دل بہت بے قرار ہے ساقی
اب ترا انتظار ہے ساقی

میرے زخموں کے پھول کھلتے ہیں
آنسوؤں کی بہار ہے ساقی

جو ترا نام لیکے پیتا ہے
اک وہی بادہ خوار ہے ساقی

مار دی لات میں نے دُنیا کو
اس کا کیا اعتبار ہے ساقی

چشمِ میگوں کا ایک ساغر اور
جان لیوا خمار ہے ساقی

کام اکثر ضمیر آتا ہے
اک یہی یار غار ہے ساقی

عشق کی داستان چھوڑ گئے
خونِ دل سے نشان چھوڑ گئے

اس سے بہتر نہ تھا مقام کوئی
آپ دل کا مکان چھوڑ گئے

پھول ترسیں گے رنگ و بو کے لیے
ہم اگر گلستان چھوڑ گئے

ڈوبنے کو تھی جب مری کشتی
ساتھ سب مہربان چھوڑ گئے

بات ہوتی ہے پر نہیں ہوتی
لوگ دل کی زبان چھوڑ گئے

جس کو عنواں نہ مل سکا اب تک
آپ وہ داستان چھوڑ گئے

آپ ملنے ضمیر سے آئے
جب وہ فانی جہان چھوڑ گئے

ہم پہ کچھ الزام نہ آئے
ایسا کوئی پیغام نہ آئے

ایسی بھی کیا مجبوری ہے
لب پہ تمہارا نام نہ آئے

تیری محبت میری حقیقت
اس پہ کوئی الزام نہ آئے

چاکِ گریباں کرنے والو
ضبطِ جنوں اب کام نہ آئے

اللہ اللہ عشق کی دُنیا
صبح نہ جائے شام نہ آئے

حُسن جواں ہے بکھرے گیسو
کوئی اسیرِ دام نہ آئے

میرا جینا میرا مرنا
تجھ بن میرے کام نہ آئے

جن کو ضمیرؔ اپنا کہتے ہو
ساتھ کبھی دو گام نہ آئے

ذروں کو آفتاب درخشاں بنائیے
اب اور ایک عالمِ امکاں بنائیے

جس وقت یاد آئے زمانہ بہار کا
ہر داغِ دل رشکِ گلستاں بنائیے

ہنس کر گلے لگا کے غمِ زندگی کو آج
خود کو حریفِ گردشِ دوراں بنائیے

دورِ خزاں نے چھین لی پھولوں کی تازگی
وقفِ بہار خونِ رگِ جاں بنائیے

حق مانگتے ہیں اپنا ہم اربابِ گلستاں
ہر ایک خار کو گلِ خنداں بنائیے

حسنِ بیاں سے بندشِ الفاظ سے سوا
افکارِ نو کو شعر سہ ساماں بنائیے

ظلمت مآب راہِ سخن ہے ابھی ضمیر
شمعِ شعور و فکر فروزاں بنائیے

تصوّر میں مرے وہ جب بھی آئے
چراغِ داغِ حسرت جھلملائے
ہزاروں مرحلے راہوں میں آئے
قدم پھر بھی نہ اپنے ڈگمگائے
ورائے منزلِ دیر و حرم ہوں
زمانہ کس طرح اب مجھ کو پائے
یہ عالم ہے مری مجبوریوں کا
ٹھیر جائے تو پھر دل ٹوٹ جائے
تیری تصویر جب بھی دیکھتا ہوں
نظر آتے ہیں کچھ اپنے بھی سائے
نہ رک اے گردشِ چرخِ بریں تو
کہیں یہ نبضِ ہستی رک نہ جائے
مرے ہمدرد دنیا میں بہت ہیں
دمِ مشکل کوئی تو کام آئے
خموشی بھی ہے اظہارِ محبت
ضمیرؔ اپنا فسانہ کیوں سنائے

کانٹے ہیں کہیں آگ کہیں سنگ کہیں ہے
یہ راہِ محبت ہے کچھ آسان نہیں ہے

تو پاس اگر ہے تو ہر اک چیز حسیں ہے
صحرا بھی نگاہوں میں مری خلدِ بریں ہے

تا عمر نبھانے کی قسم کھائی تھی تو نے
وہ عہدِ محبت بھی تجھے یاد نہیں ہے

ہو جائے فنا ذاتِ خدا میں جو کوئی ذات
کیا ڈھونڈتے ہو اس کو مکاں ہے نہ مکیں ہے

اے حسنِ حقیقت تو کبھی جلوہ دکھا دے
سجدوں کی امانت لئے بے تاب جبیں ہے

وہ چاہے تو قدموں میں زمانے کے جھکا دے
کہنے کو ترے در کا گدا خاک نشیں ہے

احساسِ غمِ دوری ہوا ہی نہیں مجھ کو
محسوس ہوا جب سے کہ تو دل کے قریں ہے

بکھرا ہوا میخانے کا شیرازہ ہے کب سے
ساقی ہے کہیں مے ہے کہیں جام کہیں ہے

ہیں جلوے نگاہوں میں حریمِ کون و مکاں کے
چھپ جائے کوئی مجھ سے یہ ممکن ہی نہیں ہے

کیا نذر کروں گردشِ دوراں کو ضمیر آج
جینے کی تمنا بھی مرے پاس نہیں ہے

غم اگر دل میں ڈوب جاتے ہیں
دل مسائل میں ڈوب جاتے ہیں

لوگ طولِ سفر سے گھبرا کر
فکرِ منزل میں ڈوب جاتے ہیں

جن کو ٹوکے ضمیر کی آواز
خشک ساحل میں ڈوب جاتے ہیں

تیرے زہریلے طنز کے نشتر
سب مرے دل میں ڈوب جاتے ہیں

ہاتھ قاتل کے جوشِ وحشت سے
خونِ بسمل میں ڈوب جاتے ہیں

کیا قیامت ہے اہلِ حق بھی ضمیرؔ
بحرِ باطل میں ڈوب جاتے ہیں

ایسا وہ دوستی کا صلہ دے گیا مجھے
اک عمر آرزو کی سزا دے گیا مجھے

خوابیدہ روح کو مری بیدار کر گیا
یہ کون آ کے دل پہ صدا دے گیا مجھے

اب اور اس سے بڑھ کے ہو عبرت کا کیا مقام
اک پھول کھل کے درسِ فنا دے گیا مجھے

منزل کا اپنی ویسے تعین محال تھا
نقشِ قدم تمہارا پتا دے گیا مجھے

مہکے ہوئے بدن سے گزر کر قریب سے
باغِ ارم کی جیسے فضا دے گیا مجھے

کانٹا ہوں پھر بھی پھول سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ
اے دینے والے کیسی قبا دے گیا مجھے

ان کی تلاش کرتے ہوئے جب میں تھک گیا
چپکے سے کوئی میرا پتا دے گیا مجھے

حاجت نہ کوئی طعنۂ احباب کی رہی
میرا ضمیر خود ہی سزا دے گیا مجھے

○

کبھی ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
بڑی اجلی اجلی تھی رہگذر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مجھے اب بھی یاد ہے وہ گھڑی مرے پاس تم رہے دیر تک
نہ تھا ہوش جب تمہیں دیکھ کر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ابھی دور منزلِ شوق تھی سرِ راہ مجھ سے بچھڑ گئے
مجھے تم نے کر دیا در بہ در تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمہاری مجھ سے شکایتیں نئی زندگی کی حکایتیں
مجھے یاد ہیں وہ تمام تر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نظر آج سوئے رقیب ہے عجب انقلاب نصیب ہے
کبھی مہرباں تھے ضمیر پر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

○

نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پہ ہنسی ہے
مری زندگی بھی کوئی زندگی ہے

نہ کر باغباں تذکرہ فصلِ گل کا
لہو میں نہائی ہوئی ہر کلی ہے

پلا اور ساقی پلا اور ساقی
ابھی تشنگی ہے ابھی تشنگی ہے

محبّت میں جینا محبّت میں مرنا
جو سچ پوچھیے تو یہی زندگی ہے

ابھی بند ہے راستہ فصلِ گل کا
چمن کی روش پر خزاں چل رہی ہے

مرے آنسوؤں کا تبسّم سلامت
شبِ تار میں کس قدر روشنی ہے

ہر اک گام پہ جو بھٹکتا ہو خود ہی
ضمیر ایسے رہبر کی کیا رہبری ہے

وہ رند جس کا نشہ ٹھہرے ہو بہ ہو رہے
ساقی تری نظر سے وہی روبرو رہے

وہ عشق کیا کہ لب پہ فقط گفتگو رہے
عاشق وہی ہے جس کی نگاہوں میں تو رہے

رسوا کیا ہے تم کو تمہارے ہی حسن نے
سورج کہیں ہے جلوہ مگر چار سو رہے

ہر زخمِ دل حیاتِ محبت کی ہے دلیل
زندہ وہی شجر ہے کہ جس میں نمو رہے

ہیں جادۂ طلب میں وہ ہر گام ساتھ ساتھ
جو اس سے بے خبر رہے وہ کو بکو رہے

احساں بھلا سکیں گے تصور کا کس طرح
وہ دور بھی رہے تو مرے روبرو رہے

سر آستاں سے اٹھ نہ سکے گا بغیرِ دید
ہاں اے نظر جبیں کی مری آبرو رہے

وابستۂ چمن کو خزاں کیا بہار کیا
جو کم نظر تھے معتقدِ رنگ و بو رہے

ہر اک صدا میں ان کی ہی آواز تھی ضمیر
ہم جن سے محوِ سلسلۂ گفتگو رہے

مجسّم بن کے جب وہ یادِ قامت سامنے آئی
قیامت آنے سے پہلے قیامت سامنے آئی

تمہارے پاک دامن کی جو نسبت سامنے آئی
نہ دنیا کی نہ عقبیٰ کی حقیقت سامنے آئی

جہاں بھی مقصدِ انساں کی عظمت سامنے آئی
وہاں اے زندگی تیری ضرورت سامنے آئی

محبّت کی کشش کہیئے یا تاثیرِ دعا کہیئے
جدھر بھی میں گیا ہوں ان کی صورت سامنے آئی

تجھے اے بے وفا ہر حال میں پہچان لیتا ہوں
تری صورت سے پہلے تیری سیرت سامنے آئی

کہیں طوفانِ سلاسل اور کہیں دلدوز بن کر
محبّت کی قسم تیری محبّت سامنے آئی

مری بربادیوں کا حال مجھ سے پوچھتے کیا ہو
جلا جب آشیاں کس کس کی صورت سامنے آئی

یہ دنیا ہے ضمیرؔ اس سے ہمیشہ دور ہی رہنا
کئی دِل لٹ گئے جب اس کی صورت سامنے آئی

کیا خبر خار زار ہے دُنیا
یا مجسم بہار ہے دنیا
آہ ہونٹوں پہ اشک آنکھوں میں
شاید انساں شکار ہے دنیا
بھُول بیٹھی ہے ہم غریبوں کو
کتنی مطلب شعار ہے دنیا
آپ ہی کے حسیں خیالوں کی
اک حسیں یادگار ہے دنیا
وہ بھی جلتے ہیں ہم بھی جلتے ہیں
کس قدر شعلہ بار ہے دنیا
میرے اشکوں کے پھول کھلتے ہیں
دیکھنا لالہ زار ہے دنیا
جب کسی کی تھی اب کسی کی ہے
کتنی بے اعتبار ہے دنیا
اپنا اپنا نصیب ہے یہ ضمیر
جائے گل ہے کہ خار ہے دنیا

لطف جینے کا سارا گیا
جب تمہارا سہارا گیا
حسنِ عارض نکھارا گیا
گیسوؤں کو سنوارا گیا
خونِ دل سے چمن میں مرے
ہر کلی کو نکھارا گیا
شامِ غم یوں گذرتی نہ تھی
وقت پھر بھی گذارا گیا
رُخ سے رک رک کے الٹی نقاب
جذبۂ دل ابھارا گیا
دیکھ کے میرا رنگِ سخن
کوئی بے موت مارا گیا
بزم میں یوں تو سب تھے ضمیر
نام میرا پکارا گیا

وہ جدا کیا ہو گیا اک حشر بر پا ہو گیا
اس بھری دنیا میں میں افسوس تنہا ہو گیا

چل رہی ہے آج کل کیسی زمانے کی ہوا
کچھ خبر بھی ہے تجھے قاتل مسیحا ہو گیا

میں اگر کھولوں زباں تو ہے نِ غم کا خوف ہے
ضبطِ غم تو ہی بتا کیا حال میرا ہو گیا

اُٹھ گئی امید جینے کی تو جی کر کیا کروں
اب اُجالا بھی مرے حق میں اندھیرا ہو گیا

زندگی اے زندگی تو ہی بتا میں کیا کروں
مجھ کو تیرے نام سے افسوس دھوکا ہو گیا

پھول برساتی ہوئی جب یاد آتی ہے تری
خارِ غم چبھنے لگا اور زخم پیدا ہو گیا

دوستوں کا واقعی کتنا بڑا احسان ہے
رفتہ رفتہ دِل مرا غم سے شناسا ہو گیا

ایک مدت سے نشیمن میں اندھیرا تھا ضمیر
دفعتاً تڑپی گری بجلی اُجالا ہو گیا

یوں بہارِ گلستاں بے آبرو ہونے لگی
پھول کے بدلے ہیں کانٹوں کی نمو ہونے لگی

کس طرف کو ہے رواں رودِ جہاں کا رواں
عظمتِ انسانیت بے آبرو ہونے لگی

کون جانے کون سمجھے عشق کا یہ فلسفہ
ہے زباں خاموش لیکن گفتگو ہونے لگی

کون سی منزل پہ لایا مجھ کو تیرے عشق نے
اب تو ہر آواز دل کی تو ہی تو ہونے لگی

یہ نگاہِ شوق میں کیسا اثر پیدا ہوا
دیدِ حسنِ یار کی اب چار سو ہونے لگی

جب کبھی عزمِ سفر ہم نے کیا ہے اے ضمیرؔ
خود ہی منزل کو ہماری جستجو ہونے لگی

کیا کروں تدبیر آخر ہم سنبھلنے کے لئے
قافلہ تیار ہے منزل سے چلنے کے لئے

اے وفادارو وفا کی راہ میں آ دیکھی
دو قدم ہی زندگی کے ساتھ چلنے کے لئے

ہم کو کشتی کی ضرورت ہے نہ ساحل کی طلب
ہم تو آئے ہیں فقط طوفاں میں پلنے کے لئے

شاعرِ فطرت ہوں میں انکار کر سکتا نہیں
ہے مرا خونِ جگر لفظوں میں ڈھلنے کے لئے

زندگی کچھ غور کر کیا وقت کہتا ہے تجھے
تو نہیں ہے اک کفِ افسوس ملنے کے لئے

ہم بدل سکتے نہیں اپنا مزاجِ زندگی
انقلاب آیا تو کیا ہم کو بدلنے کے لئے

وہ چراغِ دیر یا شمعِ حرم ہو اے ضمیر
چاہتا ہے لو کوئی پروانہ جلنے کے لئے

آپ کو خالق نے بھیجا ہے تدّبر کے لئے
آپ کب ہیں حضرتِ انساں تنفّر کے لئے

ہم نے مانا آپ آئیں گے مگر آئیں گے کب
ہم تو ہیں بے چین اظہارِ تشکّر کے لئے

خاکساری عظمتِ انساں کی ہے زندہ دلیل
زندگی انساں کی کب تھی تکبّر کے لئے

وہ ملاقاتیں نہیں وہ دن نہیں راتیں نہیں
رہ گئے جلوے تمہارے اک تصوّر کے لئے

یہ جہالت یہ کدورت یہ بغاوت چھوڑ دے
تو نے پائی زندگی علمی تبحّر کے لئے

ہر نفس میں اک نئی الجھن کو پاتا ہوں ضمیرؔ
زندگی مجھ کو ملی شاید تفکّر کے لئے

محوِ حیرت ہوں میں خود کو دیکھ کر چاروں طرف
ہے تعیّن عکس کا آئینہ گر چاروں طرف

وہ نظر آنے لگا شام و سحر چاروں طرف
دیکھتا ہوں اس کو میں آٹھوں پہر چاروں طرف

تو جہاں چاہے چلا جا بے خطر چاروں طرف
نقشِ پا ان کے بنیں گے راہ بر چاروں طرف

ہم گناہگاروں کو بس تیرے کرم پر ناز ہے
لاج رکھنی ہی پڑے گی عمر بھر چاروں طرف

اعم ہوں گے وہ وسیلہ کی ہے جن کو احتیاج
آپ کی نسبت سے ہوں میں باثمر چاروں طرف

ان کے فیضِ لطف سے غم کے دھندلکے چھٹ گئے
ہو گئی آخر شبِ غم کی سحر چاروں طرف

جام و مینا گرد میرے خود بخود پھرنے لگے
ہے مرے ساقی کی نظروں کا اثر چاروں طرف

آ گئی شاید مقامِ عشق کی منزل قریب
ان کا جلوہ دیکھتی ہے اب نظر چاروں طرف

جس کو حاصل ہے بصیرت دیکھ سکتا ہے وہی
وہ ہر اک ذرہ میں آتا ہے نظر چاروں طرف

عظمتِ فن جیسے ان کے پاؤں کی زنجیر ہے
دیکھنا پھرتے نہیں اہلِ ہنر چاروں طرف

خون رستا ہے زخم کاری ہے

زندگی کیا ستم کی ماری ہے

چشمِ ساقی کا فیض جاری ہے

میکشوں پر سرور طاری ہے

آہ یہ کیسی انتظاری ہے

بے قراری ہی بے قراری ہے

آپ سے لو لگا کے جیتے ہیں

بس یہی زندگی ہماری ہے

جو تھے معمارِ شیش محلوں کے

ان پہ الزامِ سنگ باری ہے

جس گھڑی پاس وہ نہیں ہوتے

وہ گھڑی میرے دل پہ بھاری ہے

تیرے جلوے ہیں میری نظروں میں

کس لئے مجھ سے پردہ داری ہے

ہے ضمیرؔ اِس طرف اُدھر دنیا

کون سی چیز تم کو پیاری ہے

محبت کرنے والوں کو محبّت آزماتی ہے
کسی کی آن جاتی ہے کسی کی جان جاتی ہے

تخیّل کی گل افشانی غزل کا نام پاتی ہے
کسی کی یاد سے زخموں کی دُنیا مسکراتی ہے

وفورِ غم سے شمعِ زندگانی تھرتھراتی ہے
محبت کی ہر اک دھڑکن وفا کو آزماتی ہے

کسی کے عارض ولب کی جلی ہے روشنی جب سے
بہارِ زندگی رنگینیوں میں ڈوب جاتی ہے

مرے بازو پہ زلفوں کی بھری برسات ہوتی تھی
وہ ساعت یاد آتی ہے وہ ساعت یاد آتی ہے

وہ رنگ و نور کی محفل بہاروں کی وہ رعنائی
محبّت کے وفا پرور فسانوں کو سناتی ہے

کسی کی یاد میں گم ہو گئی ہے روشنی دل کی
جو گاہے گاہے راہِ اشکِ غم کو جگمگاتی ہے

تمہاری زلف کا سایہ جو مل جائے تو رک جاؤں
تھکا ماندہ ہوا ہوں دھوپ غم کی چلچلاتی ہے

ضمیر انجامِ الفت پر لرز جاتا ہے دل اکثر
ہنسی آتی ہے جس دم آنکھ میری ڈبڈباتی ہے

کون دیکھے گا ترے ناز و ادا میرے بعد
کس کو بھر آئے گی بے وقت قضا میرے بعد

کانٹے راہوں میں بچھا پھول بچھانے والے
پھر نہ آئے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

میری آواز ہے محفوظ تری محفل میں
بام و در سے تجھے آئے گی صدا میرے بعد

زندگی تو ہی بتا تجھ کو کہاں سے لاؤں
اس کو احساس محبت کا ہوا میرے بعد

میں جو ملتا تھا تو ہنس ہنس کے گلے ملتا تھا
ڈھونڈتی پھرتی رہے گی یہ بلا میرے بعد

سانس لیتا ہوں تو شعلہ سا لپک جاتا ہے
آشیاں ایسا جلا پھر نہ بجھا میرے بعد

خونِ دل خونِ جگر خونِ وفا خونِ جنوں
تجھ کو پھر مل نہ سکا رنگِ حنا میرے بعد

ڈھونڈتا پھرتا ہے اب کوچہ بکھرا بکھرا
بے وفا کو ہوئی اب قدرِ وفا میرے بعد

عمر بھر روئے گا وہ اپنی جفاؤں پہ ضمیرؔ
یاد آئے گی اسے میری وفا میرے بعد

اس کا جلوہ مری نظروں میں سدا پھرتا ہے
ساتھ ہر وقت مرے دوست مرا پھرتا ہے

چاہنے والے کی کچھ تجھ کو خبر ہے کہ نہیں
تیرے کوچے میں کوئی شخص سدا پھرتا ہے

لاکھ پُر خار ہے یہ راہِ محبّت لیکن
کو بہ کو پھر بھی کوئی آبلہ پا پھرتا ہے

آمدِ فصلِ بہاراں کا نہ کر ذکر اے دوست
آشیاں نظروں میں اب جلتا ہوا پھرتا ہے

خاک پہچانیں گے اس کو یہ زمانے والے
عشق میں تیرے جو دیوانہ بنا پھرتا ہے

غم کی راہوں میں کوئی ساتھ نہیں دے سکتا
سنتے آئے ہیں کہ سایہ بھی جدا پھرتا ہے

پا لیا میں نے تجھے کھو کے خود اپنی ہستی
جستجو میں مری اب میرا پتہ پھرتا ہے

اس کے جلوؤں کا یہ احساں ہے عنایت ہے ضمیرؔ
وہ تصوّر میں مرے صبح و مسا پھرتا ہے

ساری خوشیاں بنیں کسی کے لئے
غم بنا میری زندگی کے لئے

زندگی کو جو مار دے ٹھوکر — عظمتِ زیست ہے اسی کے لئے
اس کو غم ہی نصیب ہوتے ہیں — جو بھی جیتا ہے راستی کے لئے
عظمتِ زیست اس کی کیا کہیئے — جو اٹھاتا ہے غم کسی کے لئے
بے حقیقت نہ جان تو غم کو — اک سہارا ہے زندگی کے لئے
مئے سے مجھ کو نہیں کوئی مطلب — پی رہا ہوں میں بے خودی کے لئے
زندگی اک عذاب ہے اپنی — تو دعا دے نہ زندگی کے لئے
آپ اوروں کے غم پہ ہنستے ہیں — حوصلہ چاہیئے ہنسی کے لئے
جن کی گلشن پہ حکمرانی تھی — وہ ہیں محتاج پنکھڑی کے لئے
پھول کھلتے ہیں میرے زخموں کے — کیا بہار آئی زندگی کے لئے
دیکھ کر ان کی مست آنکھوں کو — جی ترستا ہے میکشی کے لئے

ہم نے دیکھا ہے زندگی میں ضمیرؔ
لوگ مرتے ہیں زندگی کے لئے

◎

ایک توجہ ہو جائے کاش مہرباں اپنا
یہ زمین اپنی ہے اور یہ آسماں اپنا
جب کہ ہر رگِ گل میں خون ہے رواں اپنا
پھر یہ کیوں بنا دشمن آج باغباں اپنا
حادثات راہوں کے کیا ڈرائیں گے مجھ کو
حوصلہ سلامت ہے عزم ہے جواں اپنا
نذر زندگی کرتا عمر بھر پڑا رہتا
مجھ کو وہ بنا لیتے سنگِ آستاں اپنا
دل میں آگ ہے غم کی آنکھ سے رواں آنسو
جل رہا ہے بارش میں دیکھئے مکاں اپنا
آندھیاں بھی چلتی ہیں برق بھی تڑپتی ہے
چھڑ گیا چمن میں جب ذکرِ آشیاں اپنا
میری قبر کا سایہ چھو رہا ہے قدموں کو
بہرِ فاتحہ آیا کون مہرباں اپنا
عمر بھر نہیں سنتا جو ضمیرؔ کی آواز
وہ بھٹکتا رہتا ہے کھو کے کارواں اپنا

ھر شیخ و برہمن سے کہتا ہے یہ دیوانہ
کعبہ ہے مرے دل میں آنکھوں میں ہے بتخانہ

آباد رہے ساقی ہر وقت یہ میخانہ
مے پیتا رہوں میں بھی پیمانہ بہ پیمانہ

ہر رند یہ کہتا ہے اے ساقیٔ میخانہ
اک گھونٹ پلا کر اب کردے مجھے دیوانہ

تو برق گرا دینا اے جلوۂ جانانہ
بے تاب ہے جلنے کو میرا دل دیوانہ

اک بار اسے لاکر گھر میرا دکھا دینا
دیکھا ہی نہیں جس نے اب تک کوئی ویرانہ

تو سب پہ کرم فرمائے سب کو عطا فرما
تخصیص نہ کر ساقی اپنا ہو کہ بیگانہ

ساقی کے تصور میں ہے مست ضمیر اپنا
جلوؤں کی تجلّی سے پُر نور ہے کاشانہ

○

تصوّر میں ان سے ملاقات کرلی
کہاں رہ کے ہم نے کہاں بات کرلی

حسیں رُخ پہ زلفوں کو لہرا کے بولے
ابھی صبح تھی اور ابھی رات کرلی

نہ جینے کی خواہش نہ مرنے کی حسرت
رفاقت کچھ ایسی ترے سات کرلی

خدا جانے انجام کیا ہو ہمارا
وفا کی تو ہم نے شروعات کرلی

زمانے کے ماتھے پہ کیوں بل پڑے ہیں
کسی نے کسی سے اگر بات کرلی

مسافر کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے
کہیں صبح کرلی کہیں رات کرلی

یہ دردِ محبّت نشانی ہے ان کی
قبول اس لیے ایسی سوغات کرلی

زباں ان کی محفل میں کھلنے نہ پائی
خموشی سے تفسیرِ جذبات کرلی

ضمیرؔ وفا کا یہی مشغلہ ہے
تری بات سن لی تری بات کرلی

تنویرِ عہدِ رفتہ بڑھاتے رہیں گے ہم
آئینہ دورِ نو کو دکھاتے رہیں گے ہم

جشنِ بہارِ حسن مناتے رہیں گے ہم
کانٹوں کو بھی گلے سے لگاتے رہیں گے ہم

منزل رسی کی شان بڑھاتے رہیں گے ہم
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے رہیں گے ہم

یہ زخم زندگی کی امانت ہیں دوستو
قلب و نظر میں ان کو چھپاتے رہیں گے ہم

اپنے لہو کی دے کے چمک لفظ لفظ کو
موتی بنامِ شعر لٹاتے رہیں گے ہم

آہوں کی جب زبان کوئی جانتا نہیں
کب تک فسانۂ غم کا سناتے رہیں گے ہم

رکھنا ہے انجمن میں اجالوں کا کچھ بھرم
خونِ دل و جگر کو جلاتے رہیں گے ہم

رودادِ حسن و عشق ہماری زبان سے
سنتے رہیں گے آپ سناتے رہیں گے ہم

اک بار آپ آنے کی زحمت تو کیجئے
آنکھیں قدم قدم پہ بچھاتے رہیں گے ہم

لے کر خدا کا نام بپاسِ ضمیرؔ و ظرف
سوئے ہوئے دلوں کو جگاتے رہیں گے ہم

ہر کلی خون میں نہائی ہے
کیسے سمجھوں بہار آئی ہے

بال و پر ہو چکے ہیں نذرِ قفس
یہ رہائی کوئی رہائی ہے

تیرے غم کو لگا کے سینے سے
میری تقدیر مسکرائی ہے

بزم روشن ہے آپ کے دم سے
آپ نے شمع کیوں جلائی ہے

تیری ہلکی سی مسکراہٹ سے
محفلِ زیست جگمگائی ہے

کیا بتائیں گے تیرے دیوانے
کیا برائی ہے کیا بھلائی ہے

جب بھی اٹھا نقابِ حسن ضمیرؔ
محفلِ عشق جگمگائی ہے

آج تو نے ضمیرؔ خود آگاہ
کتنی اچھی غزل سنائی ہے

کیف پرور ہے فضا اور راستہ مہکا ہوا
آپ گذرے ہیں یہاں سے مجھکو یہ دھوکا ہوا

بیٹھے بیٹھے دل ہمارا آپ پر شیدا ہوا
جانے دیجیے جو ہوا جو کچھ ہوا اچھا ہوا

مسکرا کر لوٹ لیتے ہیں مرے ہوش و حواس
پوچھتے ہیں مجھ سے پھر وہ بھولپن سے کیا ہوا

اے حیا پرور یہ کس کے عشق کی تاثیر ہے
آج کیوں پردہ نشیں پردے سے بے پردا ہوا

وہ جو چاہے توڑ سکتا ہے تجھ پر زندگی
ایسا بھی عاشق تری محفل میں ہے بیٹھا ہوا

خالقِ انصاف تیرا کیا یہی انصاف ہے
عشق تو رسوا ہوا اور حسن کا چرچا ہوا

ہجر کی یہ کالی راتیں کیا ڈرائیں گی مجھے
آسماں عشق پر جب چاند ہے نکلا ہوا

سر سے پا تک ہر ادا کہتی ہے کہ دیکھو مجھے
جسم تیرا حسن کے سانچے میں ہے ڈھلا ہوا

اشک ٹپکے آنکھ سے اور آہ لب پر آ گئی
اے دلِ ناداں تجھے یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہوا

دل جو مدت سے ہمارا تھا پرایا ہو گیا
کیا بتاؤں حادثہ کیوں کر ہوا کیسا ہوا

اے ضمیرؔ آواز تیری رہبرِ منزل بنی
جب کوئی آیا مسافر راستہ بھٹکا ہوا

وہ عزم سفر کا مجھے اے میرے خدا دے
سر منزلِ مقصود کا قدموں پہ جھکا دے

وہ شمعِ وفا ہوں تو فنا دے نہ بقا دے
ہر شام جلا دے مجھے ہر صبح بجھا دے

ہر اشکِ غمِ دل کو تبسم میں چھپا دے
کچھ حوصلہ، ضبط زمانے کو دکھا دے

تاثیر ہے دونوں میں دوا دے کہ دعا دے
لازم ہے کہ بیمار کو قدرت ہی شفا دے

مجبور مجھے سننے کو ہو جائے زمانہ
تو اپنے فسانے کو مگر رنگِ وفا دے

سانسوں میں تسلسل سا ہے یادوں کی بدولت
کس دل سے کوئی آپ کی یادوں کو بھلا دے

احساسِ تشنگی کی کبھی لاج تو رکھ لے
مچلے ہوئے آنسو مرے دامن پہ گرا دے

جو دل میں بھڑکتا ہے ضمیر آج مسلسل
وہ شعلۂ غم دامنِ ہستی نہ جلا دے

یہ ادا بھی اک ستم ہے خود کو تنہا دیکھ کر
مسکراتے ہیں وہ آئینے میں کیا کیا دیکھ کر

مجھ کو نفرت ہو گئی دنیا سے دنیا دیکھ کر
لوگ ملتے ہیں یہاں افسوس پیسہ دیکھ کر

کوئی جلوہ دیکھ کر اور کوئی پردہ دیکھ کر
مطمئن کتنے ہیں اہلِ دل تماشہ دیکھ کر

آپ آئے بھی تو آئے راہِ دنیا دیکھ کر
بے دھڑک آ جاتے رستہ دل کا سیدھا دیکھ کر

فرق اعلیٰ اور ادنیٰ سے نہ آیا ذہن میں
نسبت دریا سے اک قطرہ میں دریا دیکھ کر

تیری محفل نے تو مجھ کو اجنبی سمجھا مگر
تیرا غم ملتا رہا چہرہ شناسا دیکھ کر

عشق کے بازار میں ہوں میں ہتھیلی پر ہے سر
کیوں ہنسی آئی خرد کو میرا سودا دیکھ کر

حالِ غم پہچاننے میں دھوکا کھا جاتے ہیں لوگ
اک تبسم سا لبوں پر میرے پیدا دیکھ کر

بے بصارت شہر میں لعل اور پتھر ایک ہیں
اے ضمیر آئے ہو کس امید پر کیا دیکھ کر

نہ مجھ کو ڈوبنے کا غم نہ مجھ کو خوفِ طوفاں ہے
مری کشتی تو کشتی ہے خدا جس کا نگہباں ہے

یہ آخر کون سی منزل میں عکسِ حسنِ جاناں ہے
کہ جس کو دیکھ کر خود آئینہ تصویرِ حیراں ہے

نہ دھجی ہے گریباں میں نہ باقی تارِ داماں ہے
مرا ذوقِ جنوں کیا حاصلِ جشنِ بہاراں ہے

نہ ہو مایوس اے دل حادثاتِ زندگانی سے
اگر ہے عزم کامل تو سمجھ لے مشکل آساں ہے

نگاہیں جس طرف اٹھیں ادھر جلوے نظر آئے
کچھ اس صورت سے شمعِ آگہی دل میں فروزاں ہے

ڈرا سکتے نہیں اس مرحلے پر حادثے مجھ کو
مرے اشکِ غمِ دل کے ہر اک قطرہ میں طوفاں ہے

وفا کیشی رضا جوئی مروت پیار ہمدردی
انہیں دو چار جذبوں میں حیاتِ عشق پنہاں ہے

شعورِ عام کیا سمجھے یہ حسن و عشق کے جذبے
کسی کی ذات افسانہ کسی کی ذات عنواں ہے

یہ سچ ہے ایک مدت ہو گئی ترکِ تعلق کو
مگر اک نشترِ غم اب بھی نزدیکِ رگِ جاں ہے

ضمیر ایسے تو جینے کو جہاں میں سب ہی جیتے ہیں
مقامِ زندگی کو جو سمجھ جائے وہ انساں ہے

تو اگر ہے تو بہارِ گلستاں ہے زندگی
ورنہ صحرا ہے بیاباں ہے خزاں ہے زندگی

صرف سانسوں کا تسلسل تو نہیں جینے کا نام
زندگی کہتے ہیں جس کو وہ کہاں ہے زندگی

آپ کی بس اک نظر سے فیصلہ ہو جائے گا
آس اور امید کے اب درمیاں ہے زندگی

تجھ سے ملنے کی تمنا لے کے ہم جیتے رہے
عمر بھر تو ساتھ رہ کر بھی کہاں ہے زندگی

جینے والے کاش ہو جاتی تجھے اس کی خبر
زندگی کے واسطے خود امتحاں ہے زندگی

اس کے دامن میں ہیں ساری دو جہاں کی نعمتیں
زندگی سے کس لئے پھر بدگماں ہے زندگی

زندگی کو کس لئے تنہا سمجھتے ہو ضمیر
آرزوؤں کا حسیں اب کارواں ہے زندگی

ناخدا کو جب خدا کا آسرا ملتا نہیں
عمر بھر اس کو کنارے کا پتا ملتا نہیں

عزم و ہمت ہو تو ہر اک راستہ نظروں میں ہے
کون سی منزل ہے جس کا راستا ملتا نہیں

حادثوں نے غم کے افسانے مرتب کر دیئے
اب کتابِ زندگی میں حادثہ ملتا نہیں

اہلِ باطن کی عنایت بھی ضروری ہے بہت
اہلِ ظاہر کے ملانے سے خدا ملتا نہیں

کچھ نہ کچھ اپنائیت نظروں میں ہونی چاہیئے
اجنبی نظروں کو صورت آشنا ملتا نہیں

جذب سانسوں میں مری یہ کون آخر ہو گیا
اب مری پہچان اب میرا پتا ملتا نہیں

حسن ہر تعمیر کا قائم ہے میری ذات میں
میں وہ مٹی ہوں مجھے چھانو تو کیا ملتا نہیں

زندگی وقفِ خیالِ دوست ہے اپنی ضمیر
اب کسی گوشے میں احساسِ انا ملتا نہیں

آجاؤ تصوّر میں میرے دربار سجا کر پھولوں کا
ہلکا سا تبسّم چھلکا کر گلزار کھلا کر پھولوں کا

اس عارض و لب کی رنگینی دیتی ہے خیالوں کو خوشبو
دکھلا دو بہاروں کا منظر اب ذکر سنا کر پھولوں کا

مہکا دو فضائے ہستی کو مدّت سے یہ اجڑی اجڑی ہے
سرکا دو نقاب رُخ اپنا نظارا دکھا کر پھولوں کا

امّید کہاں بخشش کی فقط چادر سے گلوں کی اے ناداں
رکھو ساتھ عمل کے پھولوں کو اک باغ لگا کر پھولوں کا

گلزار بنا دو محفل کو سرشار بنا دو ہر دل کو
اشعار سنا کر پھولوں کے انداز بتا کر پھولوں کا

کیا جانیں ضمیرؔ ارباب خرد یہ اہلِ جنوں کا سودا ہے
کانٹوں کو خریدا جاتا ہے بازار لٹا کر پھولوں کا

ساقی تیری نظر کے اشارے بدل گئے
ہم جیسے میکشوں کے سہارے بدل گئے

وہ مسکراتے چاند ستارے بدل گئے
تم کیا بدل گئے کہ نظارے بدل گئے

جب سے تخیلات تمہارے بدل گئے
حالات زندگی کے ہمارے بدل گئے

مدّت ہوئی کہ دار و رسن پر سکوت ہے
شاید کہ دردِ عشق کے مارے بدل گئے

دیوار و در بھی اب نظر آتے ہیں اجنبی
گھر کے ہمارے نقشے ہی سارے بدل گئے

کشتی کا اپنی جب ہے محافظ خدا ضمیرؔ
میری بلا سے لاکھ کنارے بدل گئے

تا عمر ساتھ رہ کر پھر بھی تو اجنبی ہے
کس منہ سے تجھ کو کہہ دوں تو میری زندگی ہے

وہ پوچھتے ہیں مجھ سے کیسے گزر رہی ہے
اے دل تو ہی بتا دے کیا حالِ زندگی ہے

الفاظ اس طرف ہیں تفصیل اس طرف ہے
اور درمیاں میں گویا اک نہرِ خامشی ہے

خونِ جگر کو پی کر پھر بھی میں جی رہا ہوں
کیا سمجھے کوئی کیسا معیارِ میکشی ہے

جسمِ سحر سے شب کے کیوں زخم رس رہے ہیں
کیا روشنیٔ جہاں کی پہلو بدل رہی ہے

غیروں کا ذکر کیا ہے اپنوں سے مل کے دیکھو
آنکھوں میں بے رخی ہے باتوں میں بے دلی ہے

دیکھا ہے ہم نے مل کر تم سے ضمیر اکثر
ہر بات میں تمہاری انداز شاعری ہے

میں الجھتا ہی رہا خواب کی تعبیر کے ساتھ
زندگی اور لپٹتی گئی زنجیر کے ساتھ

اس کے جلوے ہیں عیاں صبح کی تنویر کے ساتھ
آہ پلٹی ہے مری عرش سے تاثیر کے ساتھ

قطع تدبیر کا رشتہ نہ ہو تقدیر کے ساتھ
ویسے تقدیر تو چلتی نہیں تدبیر کے ساتھ

پیچ و خم سے ہمیں اے دوست ڈراتا کیا ہے
ہم نے کھیلا ہے بہت زلف گرہ گیر کے ساتھ

آج ساقی نے دیا مجھ کو شکستہ ساغر
جوڑ یہ خوب ہے پھوٹی ہوئی تقدیر کے ساتھ

کیسے قاتل ہو کیا کرتے ہو چھپ چھپ کے وار
تم کو دیکھا نہیں میں نے کبھی شمشیر کے ساتھ

ہم تو وہ ہیں جو زمانے کا مقدر بدلیں
ہم کو کیوں دیکھ رہا ہے کوئی تحقیر کے ساتھ

دامنِ ضبط نہ چھوٹے شبِ فرقت اے دل
عشق ہو جائے نہ رسوا کہیں تشہیر کے ساتھ

سنگ کھا کر ترے دیوانے نے پایا وہ صلہ
اس سے ہر دور ملا عظمت و توقیر کے ساتھ

منظرِ حسن و محبت کو ذرا دیکھ ضمیر
کھل گیا رنگ مصور کا بھی تصویر کے ساتھ

وقتِ مشکل جب بھی آیا بند دروازہ ہوا
دوستوں کی دوستی کا ہم کو اندازہ ہوا

جب چراغِ فکروفن روشن کیا ہم نے کہیں
قدروقیمت وہ ملی دل کا لہو تازہ ہوا

بس یہی دو چار ہیں شہرِ ادب میں دوستو
اور جو باقی ہیں ان پر بند دروازہ ہوا

حسن کی رعنائیوں کو کم نظر کیا دیکھتے
کس طرح روئے غزل پر خونِ دل غازہ ہوا

دورِ حاضر میں اڑیں انسانیت کی دھجیاں
منتشر اب عظمتِ انساں کا شیرازہ ہوا

خود مرے حالات نے لوٹا متاعِ زندگی
اے غمِ دل تجھ کو کیا احساسِ خمیازہ ہوا

کیا ملے دادِ جنوں اہلِ خرد سے اے ضمیرؔ
ہم کو معیارِ وفا کا خوب اندازہ ہوا

نظمیں

قطعات

متفرق اشعار

یہ نظم وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے تعزیتی جلسہ میں پڑھی گئی

چراغِ سیاست

چشمِ انسانیت غم سے پر جوش ہے
زندگی موت سے آج ہم دوش ہے

ہند کا ذرہ ذرہ سیہ پوش ہے
اب چراغِ سیاست بھی خاموش ہے

دل میں نہرو کا غم یوں اترنے لگا
شامِ غم جیسے سایہ ابھرنے لگا

ساعتِ دوپہر تھی پیامِ اجل
آفتابِ سیاست گیا آج ڈھل

غم کی تاریکیاں چھا گئیں بے محل
آہ نہرو کا ممکن نہیں ہے بدل

کھو گیا درِ نادر جو اب کہاں
ڈھونڈتی ہے جسے چشمِ ہندوستاں

دوستی پر سیاست کا رکھا مدار
مصلحت تیری تھی واقعی شاہکار

امن کو زندگی کا بنا کر شعار
تو نے بخشا ہے انسانیت کا وقار

آج دشمن بھی لیتے ہیں عزت سے نام
کر لیا تو نے پیدا دلوں میں مقام

شمع ہندوستاں رو رہی ہے لہو
لاشِ نہرو جلی مثلِ پروانہ خو

خاک نہرو کی اڑنے لگی سو بہ سو
سر برہنہ ہوئی دید کی آرزو

اک تصور تھا ہستیٔ مفقود کا
نام ہر لب پہ تھا ذاتِ موجود کا

وہ ہمالہ اجنتا و گنگ و جمن
ہاں سراپا ہیں تصویرِ رنج و محن

غم میں ہے دل فگار آج سارا چمن
بجھ گئی ہے دلوں میں خوشی کی کرن

مرگِ محبوب قائد پہ دل سے ضمیرؔ
آج سارا زمانہ ہے غم میں اسیر

مسرتوں کی ہے ہر دل میں آج اک محفل
کہ گوا ہو گیا ہندوستاں میں شامل

وہ کام ہو گیا آساں جو تھا بہت مشکل
قریب آکے قدم چومنے لگی منزل

کوئی فضا ہو یہ نعرہ ہی ہم کو پیارا ہے
ہمیں یہ فخر ہے ہندوستاں ہمارا ہے

ہمارے فن کی عطا تاج ہے اجنتا ہے
ہماری پشت پناہی کو خود ہمالا ہے

ہماری پیاس بجھانے کو رودِ جمنا ہے
غرض زمانے میں ہر سو ہمارا چرچا ہے

کوئی فضا ہو یہ نعرہ ہی ہم کو پیارا ہے
ہمیں یہ فخر ہے ہندوستاں ہمارا ہے

چلیں گے دوش بہ دوش آج ہو خلوص سے ہم
تو راستوں میں رہیں گے کہیں کبھی پیچ نہ خم

ہر ایک کام کریں گے جو مل کے ہم باہم
رہیں گے پھر نہ زمانے میں ہم کسی سے بھی کم

کوئی فضا ہو یہ نعرہ ہی ہم کو پیارا ہے
ہمیں یہ فخر ہے ہندوستاں ہمارا ہے

ہمارے قوم کے لیڈر ہوں جب جواہر لال
کسی طرح سے کبھی مشکل نہیں وطن کی سنبھال

کوئی بھی امر نہیں مہربان امر محال
اہم نہیں سر دشمن کو توڑنے کا سوال

کوئی فضا ہو یہ نعرہ ہی ہم کو پیارا ہے
ہمیں یہ فخر ہے ہندوستاں ہمارا ہے

کوئی سر اپنا اٹھائے تو سر کچل دیں گے
مقابل آئے اگر کوئی تو مسل دیں گے

بدلنا ہوگا اگر وقت کو بدل دیں گے
سپاہیوں کو نئی قوتِ عمل دیں گے

کوئی فضا ہو یہ نعرہ ہی ہم کو پیارا ہے
ہمیں یہ فخر ہے ہندوستاں ہمارا ہے

اتحاد

اتحادِ باہمی سب سے بڑا اعزاز ہے
کامرانی کا جہاں میں بس یہی اک راز ہے

ہندو مسلم دوستی اک وقت کی آواز ہے
دشمنِ امن و اماں اس میں خلل انداز ہے

ایک ہو جائیں اگر دنیا پہ چھا سکتے ہیں ہم
ہر رہِ دشوار کو آساں بنا سکتے ہیں ہم

قوتِ عزم و عمل کو آزمانا چاہیئے
سرکشوں کے سر کو قدموں پر جھکانا چاہیئے

بانٹ کر غم غم زدوں کا مسکرانا چاہیئے
جادۂ ایثار میں سب کچھ لٹانا چاہیئے

ہم نے صدیوں بعد پایا ہے عوامی اقتدار
ہاتھ سے اپنے نہ جانے پائے شانِ اختیار

مقصدِ جمہوریت کا ترجماں ہے اتحاد
عظمتِ انسانیت کا پاسباں ہے اتحاد

ہر جہت میں کامیاب و کامراں ہے اتحاد
در حقیقت منزلِ امن و اماں ہے اتحاد

ہندو مسلم مل کے چلنا چاہیئے ہر گام پر
ورنہ آنچ آجائے گی ہندوستاں کے نام پر

خوابِ غفلت سے ہمیں بیدار ہونا چاہیئے
دشمنوں سے ملک کے ہشیار ہونا چاہیئے

جان دینے ہر طرح تیار ہونا چاہیئے
کچھ وفاداری کا بھی اظہار ہونا چاہیئے

عظمتِ جمہوریت کی بس یہی پہچان ہے
آپسی ربط و محبت میں وطن کی شان ہے

پھیلی ہوئی ہے علم و ادب کی یہاں شعاع
ہے گیان چند جین کی یہ محفلِ وداع

تاریکیوں میں علم کی اک شمعِ ضوفشاں
تحقیق کو تلاش ہے جس کی وہ ہے یہاں

لفظوں میں کیا بیاں ہو تعریف آپ کی
سمجھے وہ جس کو گیان ہو تعریف آپ کی

آساں نہیں حقائقِ ہستی کا کھولنا
جو بات ذہن میں نہ ہو وہ بات بولنا

پختہ شعور و فکر ہے گہری نگاہ ہے
لطفِ ضمیر گیان کا یہ درس گاہ ہے

[حیدرآباد میں موسیو ریمو فرانسیسی سفیر کا باغ واقع تھا جو کثرتِ استعمال سے موسیٰ رام باغ ہوگیا۔ جہاں موسیو ریمو کی قبر بھی واقع ہے۔]

ہم سفر

آج بس میں بیٹھ کر تفریح کی خاطر سے ہم موسیو ریمو کی جانب جارہے تھے صبح دم
ساتھ رزاق وامیں تھے ہم خیال و ہم زباں گفتگو کا سلسلہ تھا داستاں در داستاں

یک بہ یک میری نظر اٹھی اور اٹھ کر جم گئی
جیسے بحرِ زیست کی ہر موجِ رقصاں تھم گئی

سامنے نظروں کے تھی بیٹھی ہوئی ایک نازنیں کیا کہوں تھیں کس قدر اس کی ادائیں دل نشیں
انگلیاں مہندی سے رنگیں اور چہرے پر نقاب تھا نقابِ ریشمی سے منعکس رنگِ شباب

مجھ پہ چھپ چھپ کے نظر وہ ڈالتی تھی بار بار
بجلیاں جس طرح ہوں بادل کے اندر بے قرار

ہر تبسم کے اشارے میں تھا حکمِ دور باش اور چہرہ صبحِ خنداں کی طرح تھا نوبپاش
ربط بڑھنے بھی نہ پایا وقتِ رخصت آگیا بس ٹہرتے ہی اتر کر ہوگئی مجھ سے جدا

جارہی تھی باغ کے نزدیک سے مستِ خرام
کررہی تھی ہر شجر کی شاخ جھک جھک کر سلام

ناپسندیدہ نہ ہوتا عین جنگل میں مقام کاش اس کے چاہنے والوں میں ہوتا میرا نام
ایسے ویرانے پہ فکرِ شاعرِ رنگیں نثار ذرہ ذرہ پر تصدق ماہ و انجم کا نکھار

وہ گھڑی میں میرے دل کو کرگئی زیر و زبر
کب ملے گی اے ضمیر ایسی مجھے پھر ہم سفر

وقت کی آواز ہے یہ وقت کی آواز ہے
کامیابی کا ہماری صرف یکتا راز ہے

آ بتاؤں تجھ کو یکتا میں ہیں کیسی نعمتیں
زندگی کی راہ میں ہر گام پر ہیں عظمتیں

یکتا یکتا کی صدا ہر سمت سے آتی رہے
اور فضائے زندگی یوں کیف برساتی رہے

ہندو مسلم سکھ عیسائی ہم خیال و ہم وطن
ان کے دم سے انجمن ہے ان کے دم سے ہے چمن

اب نہ اخلاص و مروت نہ وفا نہ پیار ہے
قتل و خون غارت گری کا گرم اب بازار ہے

نفرتوں کی آگ ہے اور حسرتوں کا خون ہے
کیا یہی دستور ہے اپنا یہی قانون ہے

ہم کو آزادی کا کچھ احساس ہونا چاہیئے
عظمتِ جمہوریت کا پاس ہونا چاہیئے

اے ضمیرؔ آپس میں ہم شیر و شکر ہو جائیں گے
پرچمِ امن و اماں بن کر سدا لہرائیں گے

درد دل، درد جگر، درد محبت بھیجوں
یا غمِ ذوقِ تمنا غمِ فرقت بھیجوں
دل کی ناکام تڑپتی ہوئی حسرت بھیجوں
یا ترے عشق کا احساسِ ندلت بھیجوں
غور کرتا ہوں تجھے پیش کروں کیا تحفہ

مصحفِ زیست کا اپنی کوئی عنواں لے کر
عہدِ ماضی کا وہ اندازِ بہاراں لے کر
زندگانی سے غمِ گردشِ دوراں لے کر
اپنی تخیل سے یا عظمتِ انساں لے کر
غور کرتا ہوں تجھے پیش کروں کیا تحفہ

اپنے اشعار کی رنگین بیانی دے دوں
خونِ ارماں کی اک انمول نشانی دے دوں
غم میں بڑھتی ہوئی اشکوں کی روانی دے دوں
سوچتا ہوں کہ تجھے عہدِ جوانی دے دوں
غور کرتا ہوں تجھے پیش کروں کیا تحفہ

صفِ مژگاں میں لرزتے ہوئے آنسو کی قسم
گلشنِ شوق میں بکھری ہوئی خوشبو کی قسم
اپنے بدلے ہوئے حالات کے پہلو کی قسم
کتنی گہرائی ہے محبت ترے آبرو کی قسم
غور کرتا ہوں تجھے پیش کروں کیا تحفہ

شاعری

شعر و فن کی جنّتِ ذہنی میں کھو جاتا ہوں میں
مسکراہٹ میں غمِ دل کو ڈبو جاتا ہوں میں

پاس رہ کے سب کے سب سے دور ہو جاتا ہوں میں
وقت پڑتا ہے تو کانٹوں پر بھی سو جاتا ہوں میں

دم قدم سے ہے مرے لیل و نہارِ زندگی
وہ خزاں کا دور ہو یا ہو، بہارِ زندگی

سامنے میرے مجسم ہو کے آتی ہے غزل
مجھ کو ہنستا دیکھ کے خود مسکراتی ہے غزل

جب بھی پیغامِ محبّت کو سناتی ہے غزل
مجھ سے تنہائی میں اکثر کھیل جاتی ہے غزل

وارداتِ عشق کی تشریح میرا کام ہے
شاعری کیا ہے مری الہام ہی الہام ہے

کچھ نہیں ہے فکر بس فکرِ سخن ہے صبح و شام
چھین لیتا ہے توانائی مری زورِ کلام

کس طرح ہو کاروبارِ زندگی کا اہتمام
قوّتِ احساس تجھ کو دور سے میرا سلام

ٹوٹتی ہے ہر قدم پر اک نہ اک آفت مجھے
کب میسّر ہو گا کوئی لمحۂ راحت مجھے

ذوقِ فطرت کو بدل یا پھر مری حالت بدل
زندگی دے شاعرِ برباد کی قسمت بدل

نعمتِ آرام سے کچھ درد کی لذّت بدل
اے بدلنے والے میری فکر کی صورت بدل

ورنہ میری شاعرانہ زندگی مٹ جائے گی
صفحۂ کونین سے زندہ دلی مٹ جائے گی

جشنِ آزادی

آج پھولوں پر جوانی ہے بہاروں پر شباب
آج ہر اک بزم میں بجتے ہیں پھر چنگ و رباب

ہے تبسم لب پہ غنچوں کے مہکتے ہیں گلاب
آج آنکھوں کو نظر آتے ہیں پھر الفت کے خواب

رات آہستہ گذرتی ہے محبت کے لئے
راہِ آزادی سنورتی ہے محبت کے لئے

آج گلشن میں بہاریں رقص فرمانے لگیں
اور خوشیوں کے ترانے بلبلیں گانے لگیں

چار جانب سے ہوائیں جھومتی آنے لگیں
دوش پر یادِ شہیدانِ وطن لانے لگیں

خونِ آزادی کا دیکھو کیا حسین انجام ہے
مسکراؤ مسکرانا زندگی کا کام ہے

جشنِ آزادی منائیں گائیں آزادی کے گیت
آج ہے پندرہ اگست اور آج ہے بھارت کی جیت

ہے یہی قانونِ الفت ہے یہی الفت کی ریت
مثل باپو چاہیے ہر ایک کو اپنوں سے پریت

اب وہ دنیا میں نہیں پر ان کا اونچا ہے مقام
گوشے گوشے میں رہے گا ہر زباں پر ان کا نام

آج ہر اک سانس اپنی کہہ رہی ہے اے ضمیرؔ
ہم محبت کے پجاری ہم محبت کے اسیر

ہم بہاروں کے نگہباں ہم بہاروں کے سفیر
ہم سے ہے شانِ وطن ہم قوم کے ہیں دستگیر

خونِ آزادی رگوں میں جتنا چڑھتا جائے گا
کاروانِ زندگی اتنا ہی بڑھتا جائے گا

حیراں

لباسِ نو کے پردے میں متاعِ حسن عریاں ہے | نئے فیشن کی بے باکی پہ چشمِ شرم عریاں ہے
کمر کی ہر لچک گویا حیاتِ نو کا عنواں ہے | ترقی کی یہ حالت دیکھ کے تہذیب گریاں ہے

نہیں جچتا کوئی حسنِ تقدس حسنِ خوباں پر
ہے داغِ بدنمائی چہرہ، تہذیبِ انساں پر

ابھر جاتے ہیں سب اعضاء لباسِ چست میں اکثر | نہ لے کیوں جائزہ چشمِ ہوس پھر از قدم تا سر
جہاں ہر زاویہ بتلا رہا ہے خود حسیں پیکر | نظر کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے جہاں منظر

جوانی کی یہ مستی جن کی یہ شوخیاں توبہ
بھرے جذبات کے طوفاں کی انگڑائیاں توبہ

سنبھل اے نازنینِ ہندستاں کی قسم تجھکو | خیالِ نسلِ نو رکھنا پڑے گا کم سے کم تجھ کو
کہ مستقبل کو کرنا روشن ہے ماضی کا بھرم تجھکو | رہِ انسانیت پر ہی اٹھانا ہے قدم تجھ کو

ضیاء اللہ جس کو جوہرِ شرم و حیا بخشے
مسخر کر نہیں سکتے اسے پھر مغربی فتنے

اُردُو!

تو گلشنِ نظر میں ادب کی بہار ہے　　فکر و شعور و علم کی سرمایہ دار ہے
تیری جبیں سے حسنِ غزل آشکار ہے　　دنیائے علم میں تو بڑی باوقار ہے

روشن تجھی سے غالب و چکبست کا ہے نام
دنیا میں سر بلند ہے اردو ترا مقام

دامن ہے ترا علم کی دولت سے مالا مال　　لفظوں میں تیرے حسنِ حقیقت کا ہے جمال
ہے مستند جہاں میں ترا طرزِ قیل تعال　　انشاءاللہ رہے گا ترا حسن لازوال

تو فطرتاً زبانِ وفا ہے خلیق ہے
دشمن نہیں کسی کی تو سب کی رفیق ہے

آزادِ ہند کا بھی نعرہ بنی ہے تو　　ثابت وفا پرست وطن میں ہوئی ہے تو
ہر ایک فردِ قوم کے گھر میں رہی ہے تو　　کس منہ سے کوئی تجھ کو کہے اجنبی ہے تو

تو شمعِ فکر و فن ہے متاعِ خیال ہے
تیرا وجود دہر سے مٹنا محال ہے

بے قیدِ فرقہ سب نے کیا ہے ترا طواف　　تیری ادا سے مٹ گئے ذہنوں کے اختلاف
وہ بھی ہیں دوست آج جو کل تک رہے خلاف　　لازم ہے سب پہ اب تری خدمت کا اعتراف

ہر لمحہ ترے دم سے بڑھا ہے وقارِ قوم
تو چار سو برس سے ہے خدمت گذارِ قوم

اک بلائے ناگہانی سر پہ ہے آئی ہوئی — ہر طرف دہشت پسندی کی فضا چھائی ہوئی
حق کسی کا چھین نے ناحق کی دارائی ہوئی — عظمتِ انسانیت ہے ٹھوکریں کھائی ہوئی

ہر طرف ہے خونِ انساں ہر طرف اک آگ ہے
ذکر کیا جنگل کا اپنی آستیں میں ناگ ہے

دورِ نفسی نفسی ہے یہ عہدِ بے امن و اماں — آج ہے قہر و غضب کا ہر طرف طوفاں رواں
کارواں کو لوٹتا ہے خود امیرِ کارواں — اک بھیانک شور سناٹے میں ہے ڈوبا جہاں

رحم کر نامِ محمدؐ کی قسم ربِّ کریم
تا بہ کے رنج و محن درد و الم ربِّ کریم

○

چلتے پھرتے لوگ بھی بے جاں نظر آنے لگے جسم پیراہن میں بھی عریاں نظر آنے لگے

روپ میں انساں کے حیواں نظر آنے لگے دیدہ ور بھی دیدۂ حیراں نظر آنے لگے

آدمی ہی آدمی کے خون کا پیاسا ہے آج

یہ مرض اب لادوا ہے یہ مرض ہے لاعلاج

گھر جلا کر شاد ہیں گھر لوٹ کر آباد ہیں کیا ستم ہے ملک میں کیسے ستم ایجاد ہیں

پاسبانِ قوم و ملّت مائلِ فریاد ہیں شاد ہیں اہلِ جفا اہلِ وفا برباد ہیں

ایک ہو کر بھی یہاں تقسیم ہو جاتے ہیں لوگ

وقت کے دھارے میں اب خود کو ڈبو جاتے ہیں لوگ

نفرتوں کی آگ ہے بھڑکی ہوئی چاروں طرف فرقہ بندی کی ہوا پھیلی ہوئی چاروں طرف

ہے فضائے قتل و خوں بڑھتی ہوئی چاروں طرف ذہن و دل پر بے حسی چھائی ہوئی چاروں طرف

مسجد اور مندر کی عظمت بھی تجارت ہو گئی

اے ضمیرؔ اپنے وطن کی کیسی حالت ہو گئی

سادگی انسان کے معیار کی پہچان ہے
سادگی گفتار کی کردار کی پہچان ہے

سادگی صورت گرِ معمار کی پہچان ہے
سادگی کانٹوں میں بھی گلزار کی پہچان ہے

سادگی کی شان ہی انسانیت کی جان ہے
یہ نہیں تو بس سمجھ لو آدمی حیوان ہے

سادگی کیا ہے حقیقت میں وقارِ زندگی
سادگی کیا ہے مزاجِ آدمی کی برتری

سادگی کیا ایک درسِ حاصلِ امرِ نہی
سادگی دل کے اندھیروں میں ہے گویا روشنی

خواہشِ بے جا نہ ہو جس میں وہی انسان ہے
عظمتِ انسانیت کی بس یہی پہچان ہے

سادگی کو جو بنا لیتا ہے عنوانِ حیات
بس وہی پہچان سکتا ہے یہ عرفانِ حیات

سادگی مل جائے جس کو مثلِ سامانِ حیات
اس کا ہر کار عمل ہے اصل میں جانِ حیات

اے مزاجِ دہر اب تیرے تقاضے اور ہیں
تو سمجھ سکتا نہیں اخلاق کے جو طور ہیں

سادہ دل سادہ طبیعت اور یہ سادہ خیال   واقعی کہلائے گا ہر دور میں یہ خوش خصال

اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ وفا اہلِ کمال   قابلِ تعریف ہوگی ایسی طرزِ بے مثال

زندگی کو جس نے پہنایا ہے یہ سادہ لباس

زندگیٔ چند روزہ اس کو ہی آئی ہے راس

کب خدا نے یہ کہا ہے سادگی کو چھوڑیئے   یہ حقیقت ہے حقیقت سے نہ منہ کو موڑیئے

زر پرستو حق پرستوں کے نہ دل کو توڑیئے   آپ انساں ہیں تو انسانوں سے رشتے جوڑیئے

ہے سلامت آدمیت سادگی کے نام سے

سادگی باقی رہے گی اس نرالے کام سے

اے ضمیر اب تجھ سے بڑھ کر کیا بتلائے گا کوئی   دہر کو آوازِ حق اب کیا سنائے گا کوئی

جز ترے راہِ حقیقت کیا دکھائے گا کوئی   خوابِ غفلت سے کسی کو کیا جگائے گا کوئی

سادگی میں ہم نے دیکھی ہیں خدا کی رحمتیں

عظمتِ انساں کی پوشیدہ ہیں اس میں عظمتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام برادرِ نسبتی جناب محمد عبد الکریم عرف مقبول صاحب ایم اے بی علیگ

نامۂ منظوم

سلامِ شوق ہمارا قبول ہو مقبول
تمہارے دوست رہیں شاد اور عدو ہوں ملول

خدائے پاک کی نازل ہو ہر گھڑی رحمت — تمام عمر کسی طرح کی نہ ہو زحمت
خط آیا آپ کا تسکین قلب نے پائی — وہ خط جو بن گیا دل کا انیس تنہائی
وہ سارے لفظوں میں دل کے خلوص کی تصویر — پڑھیں گے شوق سے کیوں ہم نہ آپ کی تحریر
ملی ہے آپ کو تنخواہ سن کے دل ہے شاد — قبول کیجئے اس بندہ کی مبارک باد
یہ بدنصیبی ہے بچھڑے ہو تم جو مادر سے — سوائے صبر کے چارہ نہیں ہے اب پیارے
تمہارے سر سے جو مادر کا اٹھ گیا سایا — عزیز اور اقارب کو رنج ہے اس کا
اجل کے ساتھ وہ جنت کو ہو گئیں راہی — تمہارے بیاہ کی حسرت نہ ہو سکی پوری
خدا کا شکر ہے پڑھ لکھ کے تم ہوئے عاقل — یہ سب ہے فیض پدر کا جو تم ہوئے قابل
یہ تم کو لکھا ہے جو کچھ خلیل لمحوں میں — سمٹ کے آ گیا مضمون چند لفظوں میں
جواب میں نہ ہو تاخیر یہ خیال رہے — اور انتظار کا دل کو نہ پھر ملال رہے

عزیز اور اقارب کا لکھ کے دل سے سلام
ضمیرؔ آپ کا کرتا ہے ختم اپنا کلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب حسینی ساجد صاحب جبل پوری کی دختر اول قمر شاہین سلمہا ایم۔ اے کی بی۔ ایس میں کامیابی کے موقع پر

نظم مسرت کامیابی مسمّٰی

۱۹۸۴

یا رک اللہ نسبتِ بندہ نوازی کا شباب
آپ پر ساجد حسینی ہے کرم یوں بے حساب

قرۃ العین آپ کی پائی ہیں وہ طبعِ سلیم
پورے کالج میں بڑی مشکل سے ملتا ہے جواب

ذوقِ علمی جزوِ فطرت اور ذہانت بیکراں
دیکھ لیں اک بار تو ازبر ہوں اسباقِ کتاب

حال جب ذہنِ رسا کا ہو اگر اتنا قوی
باعثِ حیرت نہیں چمکے وہ بن کر آفتاب

یہ خدا کی دین ہے اس میں نہیں کوئی کلام
کھانے والے کھاتے رہتے ہیں ہمیشہ پیچ و تاب

ہو مبارک آپ کو ساجد حسینی تہنیت
آپ کی بیٹی کا مستقبل ہے مثلِ ماہتاب

کامیابی کی لکھو تاریخ ہجری میں ضمیر
شہرۂ کامل قمر شاہین بی۔ اے کامیاب

۱۴۰۴ھ

بعون اللہ العزیز خواجہ ضمیر

۱۹۸۴ء

مبارک ہوں تجھے اے دوست یہ خوشیاں مبارک ہوں
ہلالِ عید نکلا عید کے ساماں مبارک ہوں

یہاں ہندو مسلماں عید کی خوشیاں مناتے ہیں
یہاں سب امن کا آئینہ دنیا کو دکھاتے ہیں
یہاں اپنوں کو غیروں کو بھی سینے سے لگاتے ہیں

مبارک ہوں تجھے اے دوست یہ خوشیاں مبارک ہوں
ہلالِ عید نکلا عید کے ساماں مبارک ہوں

لطافت تری قربت کی مرے نغموں میں ڈھلتی ہے
ترے جلووں کی تابانی میں میری فکر پلتی ہے
تری سانسوں کی خوشبو میں مری ہر سانس چلتی ہے

مبارک ہوں تجھے اے دوست یہ خوشیاں مبارک ہوں
ہلالِ عید نکلا عید کے ساماں مبارک ہوں

ترے ہی دم سے باقی ہے زمانے میں حیات اپنی
زمیں اپنی فلک اپنا یہ دن اپنا یہ رات اپنی
ضمیر اپنا سلامت ہے تو ساری کائنات اپنی

مبارک ہوں تجھے اے دوست یہ خوشیاں مبارک ہوں
ہلالِ عید نکلا عید کے ساماں مبارک ہوں

عید

جلوہ نما ہے ماہِ نو سوئے فلک اٹھا نظر
سن لے پیام عید کا میری خبر لے بے خبر

حسن کی تیرے دید ہو عشق کی میر عید ہو

ساغرِ مے پلا پلا ہوش مرے اڑا اڑا
روئے حسیں دکھا دکھا آنچل ذرا ہٹا ہٹا

حسن کی تیرے دید ہو عشق کی میرے عید ہو

سب کو ہے تیری جستجو تجھ کو ہے کس کی جستجو
آ کے گلے لگا مجھے پوری ہو دل کی آرزو

حسن کی تیرے دید ہو عشق کی میرے عید ہو

تیری یہ زیرِ لب ہنسی وہ رشکِ بہارِ گلستاں
حسن و جمال ہے تیرے نازِ سحر مرا جہاں

حسن کی تیرے دید ہو عشق کی میرے عید ہو

رستے بدل گئے تو کیا دونوں وطن کی شان ہیں
شیخ و برہمن آج بھی اپنے چمن کی آن ہیں

حسن کی تیرے دید ہو عشق کی میرے عید ہو

گیت

تو ناہیں آوے جی گھبرائے
کارے کارے بادل چھائے
رم جھم رم جھم جل برسائے
گیت ملن کے کوئل گائے
آجا آجا آجا آجا
آ آ آ جا آ آ آ جا

میں بیراگن میں دکھیاری
پریت کی پیاسی پیت کی ماری
گلین گلین تو ہے پکاری
یاد میں رو رو رین گذاری
آجا آجا آجا آجا
آ آ آ جا آ آ آ جا

تجھ بن جیون جیون ناہیں
تجھ بن گلشن گلشن ناہیں
تجھ بن ساون ساون ناہیں
تجھ بن کچھ بھی ساجن ناہیں
آجا آجا آجا آجا
آ آ آ جا آ آ آ جا

سانس کا بندھن ٹوٹ نہ جائے
دل کا پھپولا پھوٹ نہ جائے
روح کا پنچھی چھوٹ نہ جائے
آس کو بیرن لوٹ نہ جائے
آجا آجا آجا آجا
آ آ آ جا آ آ آ جا

کیا تمہیں یاد نہیں

پھول کھلتے تھے بہاروں کے پیام آتے تھے
چاند تاروں سے محبت کے سلام آتے تھے
مست آنکھوں سے چھلکتے ہوئے جام آتے تھے

کیا تمہیں یاد نہیں کچھ بھی تمہیں یاد نہیں

میں تمہیں جانِ غزل جانِ وفا کہتا تھا
میں تمہیں دل کے دھڑکنے کی صدا کہتا تھا
میں تمہیں دردِ محبت کی دوا کہتا تھا

کیا تمہیں یاد نہیں کچھ بھی تمہیں یاد نہیں

میرے دل میں رہے تم دل کا سہارا بن کر
میری آنکھوں میں رہے آنکھوں کا تارا بن کر
جیسے طوفان میں ہو کوئی کنارا بن کر

کیا تمہیں یاد نہیں کچھ بھی تمہیں یاد نہیں

تم نے جب ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی
زندگی پیار کی قدموں میں سمٹ آئی تھی
دلِ تاریک میں اک روشنی لہرائی تھی

کیا تمہیں یاد نہیں کچھ بھی تمہیں یاد نہیں

درد بن کر مرے سینے میں اتر جاتے تھے
اشک بن کر مری پلکوں پہ ابھر جاتے تھے
ہے ضمیر اپنا یہ کہتے ہوئے مر جاتے تھے

کیا تمہیں یاد نہیں کچھ بھی تمہیں یاد نہیں

آں وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کے تعزیتی جلسہ میں یہ قطعہ سنایا گیا

وادیوں میں موت کی نایاب گوہر کھو گیا
روشنی کا ہند کی ہائے مقدر سو گیا
راجیو کی موت پر ہر فردِ عالم کا ضمیر
دل گرفتہ ہو گیا مصروفِ ماتم ہو گیا

یہ تقریبِ اکادی جو نشاطِ جاودانی ہے
یہ قومی ایک جہتی کی گویا زندہ نشانی ہے
وقارِ ہند دنیا میں سلامت ہے ضمیر اپنا
یہی تو عظمتِ انسانیت کی راجدھانی ہے

صاحبزادی حشمت بانو سلمہا کی پیدائش پر

قطعات

○

ہر ایک کا دل خرسند ہے اب پیدائش حشمت بانو سے
گھر بھر میں خوشی کی دھوم مچی ہے خاص جو فضل ربانی
تاریخ تولد کہدو ضمیر اب تم بھی صوری صنعت میں
تیرہ سو اٹھہتر ہجری ہے اور گیارہ جمادالثانی

۱۳۷۸ھ

○

تمنا ہے یہی دل کی گر میرا ساتھ دے قسمت
بچھا دوں تیرے قدموں میں زمانے بھر کی ہر راحت
ضمیر خستہ دل کی آرزوں کا تقاضا ہے
تجھے پروان چڑھتے دیکھ لوں آنکھوں سے اے حشمت

لطف کی بنیاد ہو یا عیش کی تمہید ہو
بے ارادہ بار آور دل کی ہر امید ہو
جو ہم ایسے درد مندوں کو بھی خوش کر دے کبھی
بندہ پرور عید ہو کوئی تو ایسی عید ہو

جاں بلب سی ہو گئی ہے دل میں حسرت عید کی
دب گئی ہے کس قدر موج مسرت عید کی
مسکراہٹ میں نہاں طوفانِ غم ہے اے ضمیر
ہائے کس ماحول میں دیکھی ہے صورت عید کی

عید آئی ہے غریبوں کو رلانے کے لئے
دل کے ارمانوں کو مٹی میں ملانے کے لئے

آ رہا ہے خیالِ عید مجھے
جانے کیا دے ہلالِ عید مجھے

خوشی کا ذکر کہاں غم کو ساتھ لائی ہے
یہ تحفہ لے کے ضمیر آج عید آئی ہے

عیش و عشرت اور طرب کا لطف تیری دید ہے
تو نہیں جب سامنے تو خاک میری عید ہے

جب گلستاں کو بہاروں سے سجایا میں نے
گل تو ہاتھ آ نہ سکا خار ہی پایا میں نے
یوں تو روشن کیا ہر گوشۂ دنیا کو ضمیر
دیکھا اپنے ہی شبستاں پہ اندھیرا میں نے

اس قدر بدلی ہوئی قسمت پہ کیوں حیران ہے
مرتبہ تیرا بہت اونچا ہے تو انسان ہے
مشکلوں میں یاد رکھ بس اک یہی حرفِ ضمیر
عزمِ کامل ہو تو ہر مشکل تری آسان ہے

کیا پوچھتا ہے مجھ سے نظامِ بہار تو
پھولوں سے بڑھ کے خار کی ہوتی ہے آبرو
سیرِ چمن سے آج تو باز آئے ہم ضمیر
ہر پھول میں ہے خونِ جگر خونِ آرزو

شاعری کا ہے تعلق اس طرح عرفان سے
زندگی کا ربط ہے جس طرح جسم و جاں سے
کور باطن کیا مقامِ شاعری سمجھے ضمیرؔ
پوچھیے اس کی حقیقت حضرتِ حسانؓ سے

جھومتے ہیں میری خوش فکری پہ شیخ و برہمن
گرم ہو جاتی ہے مجھ سے محفلِ شعر و سخن
خونِ دل خونِ جگر کا رنگ لے کر اے ضمیرؔ
پھوٹتی ہے میری غزلوں سے محبت کی کرن

میرے مسلک میں ہے سب روحانیت کا اہتمام
میں ہوں شاعر کیوں نہ اعلیٰ ہو مرا فکری مقام
بس یہی میرا طریق بندگی ہے اے ضمیرؔ
ذکرِ خالق ہے مری نوکِ زباں پر صبح و شام

تری الفت کے رشتے اس طرح سے ٹوٹ جاتے ہیں
کہ جیسے دل میں چھالے پڑتے ہیں اور پھوٹ جاتے ہیں

○

اسرارِ معرفت کا سمندر ضمیر ہے
ہر منزلِ حیات کا رہبر ضمیر ہے
خونِ جگر ٹپکتا ہے جس کے کلام سے
وہ زندگی شناس سخنور ضمیر ہے

○

ناقدریٔ سخن کی ہے غمناک داستاں
مرنے کے بعد سر پہ بٹھاتا ہے یہ جہاں
قدرِ ہنر بقدرِ ہنر بھی نہیں ضمیر
افسوس اہلِ ذوق کا کیا کیجئے بیاں

○

دیپ پلکوں پہ جگمگاتے ہیں
زخمِ دل جب بھی مسکراتے ہیں
جھونکے بادِ بہارِ غم کے ضمیر
باغِ ہستی کو لہلہاتے ہیں

○

گلشنِ فکر میں ضمیر اپنے
کتنی رنگیں بہار آئی ہے
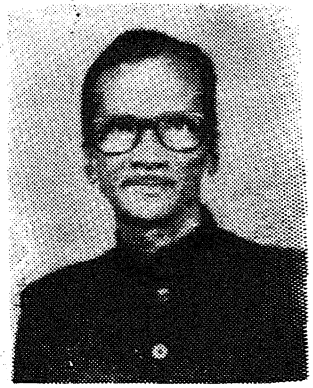
صدائے ضمیر

جناب خواجہ ضمیر صاحب کے اطوار قلندرانہ ہیں۔ میں کم ازکم تیس سال سے ضمیر شناس رہا ہوں ــــ اِن کی طبیعت کی یکسانیت' تعریف و صلہ سے بے نیازی ــــ نہ کسی سے یارانہ ــــ نہ کسی سے دشمنی' کسی سے ملے تو خیریت پُوچھ لی! ــــ یہ سب کی نبضیں ٹٹولتے ہیں' چونکہ پیشۂ طب ہی ان کی روٹی کا ذریعہ ہے۔ مَیں یہ بھی جانتا ہوں' اِن کی نبض کوئی دیکھنے والا نہیں اور نہ کوئی خیریت دریافت کرنے والا ــــ اپنے اور اپنے متعلقین کے دُکھوں کا مُداوا ہی ان کی زندگی ہے۔ بقول ان کے

نہ مجھ کو ڈُوبنے کا غم' نہ مجھ کو خوفِ طُوفاں ہے
مِری کشتی وہ کشتی ہے' خدا جس کا نگہباں ہے

ایمان و ایقان کی یہ پختگی' انسان کو ایک کردار عطا کرتی ہے اور جو ــــ بے ضمیر ہوتا ہے اُس کے کردار کی بات ہی کیا ہے!؟

"صدائے ضمیر" انہی احساسات پر مشتمل' مجموعہ ہے۔ ہم عموماً بڑے ناموں اور دُور کے ڈھولوں کی آوازوں پر کان لگانے اور آنکھیں بچھانے کے عادی ہو گئے ہیں ــــ خواجہ ضمیر ایک چھوٹا نام ہے۔ آپ ضمیر کو پڑھیں گے تو محسوس ہوگا' آپ کا ضمیر کس کس مقام پر آپ کو کچوکے لگائے گا ــــ شرط' بلا تحفّظِ ذہنی پڑھنے کی ہے!

سلام خوشنویس عُفی عنہ